ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

(تاثراتی مضامین)

محفل میں سب رہیں گے افسوس ہم نہ ہوں گے
بچھڑے ہوئے ملیں گے افسوس ہم نہ ہوں گے
پرکھوں کو یاد کرکے آنسو بہانے والے
ہم کو دعائیں دیں گے افسوس ہم نہ ہوں گے

صلاح الدین نیّر

تاریخ وسن اشاعت ...... یکم نومبر ۲۰۰۰ء

تعداد صفحات ۱۸۶

تعداد اشاعت ۵۰۰

قیمت ...... ۱۰۰ روپے

کتابت ...... سید انور احمد

طباعت ...... اعجاز پرنٹنگ پریس

چھتہ بازار۔ حیدرآباد ۲

ناشر ...... صلاح الدین نیّر

ملنے کا پتہ

● سیاست سیل کاؤنٹر ۔ جواہر لال نہرو روڈ حیدرآباد ۱

● حسامی بک ڈپو ۔ مچھلی کمان پتھر گٹی ۔ حیدرآباد ۲

● مصنف ۔ کہکشاں ۱۱-۳-۸۲۴/۷ ملے پلی حیدرآباد ۱

فون نمبر ۳۳۴۰۰۱۵

ترتیب و تزئین

"ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے" صلاح الدین نیر ۵

مضامین

اِنتساب

اپنے مشفق و محترم والدین اور اپنے معظم و محتشم اہلِ خاندان کی اُن اعلیٰ اقدار کے نام جو میری زندگی کا انمول اثاثہ ہیں ۔

صلاح الدین نیّر

"ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے"

"ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے" میری ۲۵ ویں کتاب ہے تا حال میری اور مجھ سے متعلق ۲۴ کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن کی تفصیل کچھ اس طرح ہے
مجموعۂ کلام : گلِ تازہ (۱۹۶۵ء) زخموں کے گلاب (۱۹۷۲ء) صنم تراش (۱۹۷۸ء) شکن در شکن (۱۹۷۹ء) خوشبو کا سفر (۱۹۸۳ء) رشتوں کی مہک (۱۹۸۶ء) سفر جاری ہے (۱۹۸۸ء) یہ کیسا رشتہ ہے (۱۹۹۰ء) کیا کیا جائے (۱۹۹۴ء) گلفشاں (۱۹۹۹ء) نیلم زرفشاں (۲۰۰۰ء)
نثری مطبوعات : سلسلہ پھولوں کا (خود نوشت سوانح ۱۹۹۲ء) پھر وہی پرچھائیاں (مضامین، خاکے، سفرنامے، تبصرے) (۱۹۹۴ء) قافلے یادوں کے (المیہ تحریریں) (۱۹۹۳ء) کہکشاں (۱۹۹۶ء) بیاد ثنا (محبوب حسین جگر) (۱۹۹۸ء) خوشبو سے بہاراں (۲۰۰۱ء) ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے
تالیف : عظمت عبدالقیوم۔ فن اور شخصیت (۱۹۸۸ء) عظمت خیاباں (عظمت عبدالقیوم کے مضامین، افسانے، شاعری) (۱۹۸۹ء) فیضانِ رسول (۱۹۹۵ء) صالحہ الطاف، فن اور شخصیت (۲۰۰۱ء)

صلاح الدین نیر سے متعلق کتابیں : قافلہ چلتا رہے گا (صلاح الدین نیر اور شخصیت ۱۹۹۲ء (از عاتکہ الطاف / ڈاکٹر صابرہ سعید) گیتا لو (۱۹۶۵ء) گل تازہ کی منتخب غزلوں کا منظوم ترجمہ۔ مترجم شمس الدین کموڈی۔ ترتیب کار۔ ہیرالال موریا۔ صلاح الدین نیر فن اور شخصیت (۱۹۹۴ء)۔

سال رواں (۵ ارجون ۲۰۰۱ء) میں خوشبوئے بہاراں کے نام سے میرے تاثراتی مضامین پر مشتمل کتاب شائع ہوئی ہے جس میں بہ قید حیات ۲۰ ایسی شخصیتوں پر میں نے مضامین لکھے ہیں جنہوں نے حیدرآباد کی علمی وادبی، تعلیمی وصحافتی، فلاحی واصلاحی، تہذیبی وثقافتی زندگی میں کارہائے نمایاں انجام دی ہیں۔ ان محترم شخصیتوں کے اسم گرامی یہ ہیں نواب شاہ عالم خان، ڈاکٹر سید عبدالمنان، ہاشم علی اختر، ولی قادری ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، ڈاکٹر زینت ساجدہ، ڈاکٹر سی نارائن ریڈی، پروفیسر جعفر نظام، ایم باگا ریڈی، کنول پرشاد کنول، پروفیسر مغنی تبسم، زاہد علی خان حفیظ الرحمٰن، پروفیسر افضل محمد، آصف پاشاہ، ڈاکٹر شیام سندر، ڈاکٹر وقار رسول خان، شریمتی رودرا مستری، تجمل حسین اور ڈاکٹر موہن لال نگم۔

"ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے" میں شہر کی ۲۱ ایسی نمائندہ شخصیتوں پر تاثراتی مضامین شامل ہیں جو اوراق ماضی کے زمرہ سے تعلق رکھتی ہیں اور جن کے کارہائے نمایاں حیدرآباد کی علمی و ادبی و تہذیبی و ثقافتی زندگی میں محفوظ رہیں گے۔ "خوشبوئے بہاراں" اور "ہمیں سو گئے

داستان لکھنے کہنے" میں شامل تمام شخصیتوں پر جن کو میں نے اپنی ادبی و صحافتی زندگی میں جس طرح محسوس کیا اپنے روابط اور مراسم کی بنیاد پر مضامین لکھے ہیں۔

"اوراقِ ماضی" سے تعلق رکھنے والی حسبِ ذیل شخصیتیں ہیں۔
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور، پروفیسر حبیب الرحمن، پروفیسر عبدالقادر سروری، پروفیسر ابوالظفر عبدالواحد، پروفیسر سید محمد، رائے جانکی پرشاد عابد علی خان، محبوب حسین جگر، ڈاکٹر حسینی شاہد، بھارت چند کھنہ، علامہ حیرت بدایونی، علامہ قدر عریضی، مخدوم محی الدین، شاہد صدیقی، خورشید احمد جامی، سعید شہیدی، اوج یعقوبی، امیر احمد خسرو، سلیمان اریب، خیرات ندیم اور شاذ تمکنت۔

خوشبوئے بہاراں کے سلسلے کی ایک اور کتاب کے لئے بھی تقریباً ۲۰ شخصیتوں پر مضامین لکھ چکا ہوں۔ انشاء اللہ یہ کتاب بھی بہت جلد شائع ہوگی۔

میری پچھلی کتابوں سلسلہ پھولوں کا، پھر وہی پرچھائیاں اور کہکشاں میں حیدرآباد کے زائد از ۳۰ منتخب شاعروں، ادیبوں پر تعارفی مضامین شامل ہیں۔ ماہنامہ "خوشبو کا سفر" کے منتخب اداریئے بھی ترتیب پا چکے ہیں۔ سروریج (مدھیہ پردیش) کے ایک سینئر صحافی و ادیب جناب محمد توفیق خان نے بھی "خوشبو کا سفر" کے منتخب اداریوں پر مشتمل کتاب کے لئے مسودہ تیار کیا ہے یہ کتاب بھی کسی مناسب وقت پر

شائع ہوگئی۔ سنہ ۱۹۶۳ء تا ۱۹۶۷ء تک سیاست اخبار میں محمد قلی قطب شاہ سے لے کر رئیس اختر تک ۱۲۴ شاعروں پر میرے تعارفی مضامین معہ نمونۂ کلام شائع ہوئے ہیں ان شاء اللہ ان مضامین کو بھی کتابی شکل دی جائے گی۔ میری یہ بھی خواہش ہے کہ منتخب نعتوں کا مجموعہ شائع کیا جائے۔ نیلم زرفشاں (۲۰۰۰ء) کی اشاعت کے بعد کہی ہوئی بہت سی غزلیں بھی کتابی شکل اختیار کرنے کی منتظر ہیں۔ میں نے اپنے محدود اندازے کے مطابق ۱۹۶۰ء سے تاحال تقریباً ۱۵۰ مضامین لکھے ہیں۔ ۱۹۶۰ء سے ہی شعری و ادبی ماحول میرے لئے سازگار رہا اور بغیر کسی رکاوٹ کے میرا شعری و ادبی سفر جاری ہے۔ اخبار سیاست سے میری وابستگی ۱۹۵۹ء سے ہے جناب عابد علی خاں صاحب ایڈیٹر سیاست اور جناب محبوب حسین جگر جوائنٹ ایڈیٹر کی ذہنی تربیت و سرپرستی نے مجھے ادبی دنیا میں متحرک رہنے کا حوصلہ دیا۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور پہلی شخصیت ہیں جنھوں نے مجھے ادبی دنیا میں سرگرم عمل رہنے کی ترغیب دی تھی ان کے بعد بعض نامور شخصیتوں کے علاوہ جناب عابد علی خان صاحب اور جناب محبوب حسین جگر صاحب کی مہربانیاں کچھ زیادہ ہی میرے شامل حال رہیں۔ ایمانداری کی بات تو یہ ہے کہ محبوب حسین جگر صاحب میری شعری و ادبی زندگی کو سنوارنے میں میرے رہبر اولین رہے ہیں ان ہی کی رہبری کی مشعل آج بھی میرے سفر میں ساتھ دے رہی ہے اگر جگر صاحب اور عابد علی خان صاحب "سیاست" کے ذریعہ میری

مناسب حوصلہ افزائی نہ فرماتے تو شاید میں شعروادب سے اپنی دلچسپی کے باوجود وہ مقام نہیں پاتا جہاں میں آج ہوں۔ وقتاً فوقتاً میرے بعض احباب کے مشورے بھی میرے لئے مفید ثابت ہوتے رہے۔

میں ان تمام شخصیتوں اور ان موافق حالات کا احسان مند ہوں جو ہمیشہ مجھے تپتے ہوئے صحراؤں میں بھی ٹھنڈی چھاؤں کی سوغات سے نوازتے رہے۔

صلاح الدین نیّر

"کہکشاں"
جدید ملے پلی۔ حیدرآباد

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

آبروئے دکن، ناقابلِ فراموش محسنِ اردو

ہر دور میں کچھ ایسے لوگ بھی پیدا ہوتے ہیں جن کا نام نسل در نسل صبح روشن کی طرح منور رہا کرتا ہے۔ یقیناً وہ لوگ خوش نصیب ہوتے ہیں جو ہزاروں، لاکھوں لوگوں میں اپنی پوری شناخت کے ساتھ اپنے وجود کا احساس دلاتے ہیں اور اس طرح کی شخصیتیں جو مختلف شعبۂ حیات سے تعلق رکھتی ہیں ان کے نام نہ صرف وردِ زبان ہی رہتے ہیں بلکہ ان کی خوشبو معاشرہ کے تمام گوشوں کو مہکاتی رہتی ہے وہ لوگ بھی خوش قسمت سمجھے جائیں گے جنھیں اعلیٰ مرتبت، بلند قامت، قابلِ احترام شخصیتوں کے دور میں پیدا ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ ایسی ہی برگزیدہ قابلِ تعظیم و لائقِ تکریم لوگوں میں سے ایک تھے جو ادبی تاریخ کا ایک اہم اور روشن حصہ سمجھے

جانتے رہیں گے۔ ایسے لوگ جو ایک خاص مقصد کے لئے جیتے اور مرتے ہیں وہ ہمیشہ یاد رکھے جاتے ہیں ڈاکٹر زور اردو زبان اور اردو تہذیب کے لئے ایک ایسا عظیم سرمایہ تھے جن کے ذکر سے ہی صف اول کے بلند قامت محبین اردو کے چہرے جگمگانے لگتے ہیں۔ ڈاکٹر زور نے ادارہ ادبیات اردو کی بنیاد رکھ کر نہ صرف اپنے دور کے محبان اردو کے لئے نمایاں خدمات انجام دیں بلکہ آنے والی نسلوں کو بھی اپنے تہذیبی ورثے کی سوغات سے نوازا۔ دکنی زبان اور دکنی تہذیب کو بھی اجاگر کرنے میں ڈاکٹر زور کا نام سر فہرست رکھا جا سکتا ہے ڈاکٹر زور نے دکنی زبان اور دکنی ادبیات کی تحقیق میں اہم و نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ ڈاکٹر زور کو سرزمین دکن کے چپہ چپہ سے گہری دلبستگی تھی انہوں نے یہاں کے موسم، یہاں کی آب و ہوا۔ یہاں کی زبان اور یہاں کی تہذیب و ثقافت کی اعلیٰ قدروں کے تحفظ کے لئے بھی بہت کچھ سوچا تھا اور انہوں نے بہت کچھ کر دکھایا۔ ڈاکٹر زور کردار کے ہی غازی نہیں تھے بلکہ گفتار کے بھی غازی تھے انہوں نے جو سوچا کر دکھایا۔ جب ڈاکٹر زور نے محسوس کیا کہ بیرون حیدرآباد کے لوگ حیدرآباد کے دانشوروں، یہاں کے علمی و ادبی اداروں اور یہاں کے محبان اردو کو نظر انداز کر رہے ہیں تو انہوں نے یہ احساس دلانے کے لئے کہ حیدرآباد میں بھی کچھ ایسے لوگ موجود ہیں جو اپنی تہذیب، اپنے کلچر اپنی زبان سے والہانہ دلبستگی رکھتے ہیں۔ اپنی سرزمین کے ہر حصہ کو اپنے

بزرگوں کا ایک عظیم ورثہ سمجھتے ہیں۔ زورؔ صاحب نے "علم و ادب کی دنیا میں اپنے اسلاف کے عظیم کارناموں کی بازیافت کے لیے قدم اٹھایا ادارۂ ادبیاتِ اردو کے قیام کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ ساری اردو دنیا کو حیدر آبادیوں کے وجود کا احساس دلایا جائے۔ حیدر آباد میں کیا نہیں ہے؟ حیدر آباد نے کیا کچھ نہیں دیا؟ اگر حیدر آباد کا دامن کشادہ نہ ہوتا، یہاں کے اربابِ حجاز فراخ دلی کا مظاہرہ نہ کرتے تو ملک بھر کے مشاہیرِ ادب ہرگز حیدر آباد کا رُخ نہ کرتے۔ حیدر آباد نے باہر سے آنے والوں کو پناہ دی۔ اپنی امان میں رکھا۔ اُن کی روٹی روزگار کا انتظام کیا اور انھیں باوقار انداز میں مہذب شہری کی طرح یہاں کے ماحول میں سانس لینے کا موقع فراہم کیا۔ ڈاکٹر زورؔ نے جب اپنے رفقائے کار کے تعاون سے ادارۂ ادبیاتِ اردو کا قیام عمل میں لایا تو شہر کے دانشوروں اور صاحبانِ علم و فن سے مختلف موضوعات پر کتابیں لکھوائیں۔ تصنیف و تالیف کا کام جاری رہا۔ وہ اہم دستاویزات جو اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے اُن کا تحفظ کیا۔ اُن دنوں ادارۂ ادبیاتِ اردو کے امتحانات اردو دانی، زبان دانی، اردو عالم، اردو فاضل کا بڑا چرچہ تھا مجھے اردو شعر و ادب سے ابتداء ہی سے دلچسپی تھی، میں نے اردو عالم اور اردو فاضل کے امتحانات امتیازی حیثیت سے کامیاب کیے۔ اس زمانے میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے میٹرک کا امتحان کامیاب کرنے کے بعد ادیب کامل (علیگڈھ) کا امتحان

کامیاب کیا تھا الحمد للہ جامعہ نظامیہ سے منشی فاضل کا امتحان بھی پاس کیا تھا۔ اُن دنوں میں نے ادارۂ ادبیاتِ اُردو کی ادبی تقاریب و مشاعروں میں شرکت کرنا شروع کی تھی میں بھی اس دور کے بعض نوجوان شاعروں اور ادیبوں کی طرح ڈاکٹر زورؔ کی نظر میں آ گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کرتا رہا۔ ڈاکٹر صاحب ہر ملاقات میں اُردو زبان سے دلچسپی لینے اور شعر و ادب کی سرگرمیوں کو جاری رکھنے کی تلقین کیا کرتے تھے ڈاکٹر زورؔ کی سرپرستی اور اُن کی کرم فرمائیوں سے میں ادارۂ ادبیاتِ اُردو میں ہونے والی ہر ادبی تقریب میں مدعو کیا جاتا تھا خاص طور پر مشاعروں میں شرکت لازمی سمجھی جاتی تھی۔ میں نے ادارۂ ادبیاتِ اُردو میں ہونے والے بیسیوں مشاعروں کی معتمدی کے فرائض انجام دیئے ہیں میں نے ادارۂ ادبیاتِ اُردو ہی میں پہلی دفعہ اُردو کے نامور شاعر تلوک چند محرومؔ (والدِ محترم پروفیسر جگن ناتھ آزادؔ) کو دیکھا تھا میری اُن پر اُس وقت نظر پڑی جب وہ ادارۂ ادبیاتِ اُردو کے مہمان خانہ کی طرف جا رہے تھے ادارۂ ادبیاتِ اُردو بھی انجمن ترقی اُردو کی طرح شعری و ادبی تقاریب کے لئے مرکزی حیثیت رکھتا تھا۔ اگر ان دنوں بیرونِ شہر کے نامور ادیب و شاعر یا اُردو جامعات سے تعلق رکھنے والے اساتذہ حیدرآباد آتے تو ادبی نشست اور خیر مقدمی تقریب ہوا کرتی تھی مجھے وہ مشاعرہ بھی یاد ہے جس میں نامور ترقی پسند شاعر سجاد ظہیر صاحب کا خیر مقدم کیا گیا تھا ان کے اعزاز میں ایوانِ اُردو میں مشاعرہ ہوا تھا

میں نے بھی کلام سنایا تھا شہر کے نمائندہ شعرا مدعو تھے اس مشاعرہ میں ڈاکٹر زور نے پہلی دفعہ اپنا کلام سنایا تھا انہوں نے یہ غزل سنائی تھی

ایسے بے درد و بد اندیش یہاں ہیں کچھ لوگ
جو سمجھتے نہیں پابندِ فغاں ہیں کچھ لوگ

اک نگاہِ غلط انداز سہی دیکھ تو لیں
آپ کے چاہنے والوں میں یہاں ہیں کچھ لوگ

پینے والے مئے و مینا پہ نظر رکھتے ہیں
چشمِ ساقی کی طرف کیوں نگراں ہیں کچھ لوگ

زندگی زندہ دلی ذوقِ طلب شوقِ عمل
عہدِ پیری میں بھی اے زورؔ جواں ہیں کچھ لوگ

اس غزل سے متاثر ہو کر حیدرآباد میں بعض انجمنوں نے طرحی مشاعرے رکھے۔ ڈاکٹر زور کو ادارۂ ادبیاتِ اردو کی علمی و ادبی تقاریب سے والہانہ وابستگی تھی وہ چاہتے تھے کہ ادارۂ ادبیاتِ اردو کے زیرِ اہتمام ہونے والی ہر ادبی تقریب اور شعری نشستیں معیاری رہے۔ یوم محمد قلی قطب شاہ تقاریب میں ہر سال پابندی سے شرکت کرتا تھا احاطہ گنبد محمد قلی قطب شاہ گولکنڈہ قلعہ میں ہونے والی افتتاحی تقریب میں لازماً شریک رہتا۔ اس تقریب کے سارے انتظامات ... ڈاکٹر زور کی راست نگرانی میں انجام پاتے تھے اس تقریب میں کثرت سے عوام و خواص شرکت کرتے تھے جلسہ گاہ میں تل دھرنے کی جگہ نہیں رہتی تھی افتتاحیہ تقریب کے شعبہ انتظامی کے صدر آغا حیدر حسن ایرانی مرحوم تھے ایک دفعہ کا واقعہ ہے

کہ لوگوں کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی تھی جلسہ گاہ میں داخل ہونے کے لئے زور آزمائی کا مظاہرہ ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر زور رشہ نشین کے قریب انتظامات کی نگرانی کر رہے تھے ڈاکٹر صاحب نے وہیں سے حسین ضابط کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ حسین ضابط۔ ہمیط ضبط۔ یہ جملہ آج بھی میرے کانوں میں گونجتا رہتا ہے اب نہ ڈاکٹر زور ہیں اور نہ ہی حسین ضابط رہے لیکن یہ واقعہ مجھے برسوں تک یاد ہے۔ ڈاکٹر زور کی خواہش تھی کہ میں یوم محمد قلی قطب شاہ کی افتتاحیہ تقریب میں مخدوم محی الدین صاحب کی نظم بھاگ متی ترنم سے سناؤں۔ میں نے یہ خوشی آمادگی ظاہر کی اور اپنے لئے باعث فخر سمجھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے ڈرائنگ روم میں مجھے اپنے بڑے صاحبزادے تقی الدین سے ملوایا۔ مجھ سے نظم بھاگ متی سنانے کی خواہش کی۔ میں نے ترنم میں نظم سنائی۔ لیکن انھیں میرا ترنم کچھ زیادہ پسند نہیں آیا تو انھوں نے اپنے بڑے صاحبزادے تقی الدین سے کہا کہ نظم سناؤ۔ تقی الدین کا ترنم ڈاکٹر صاحب کو پسند آیا پھر مجھ سے فرمایا کہ تم اس لے ترنم میں نظم سناؤ۔ میں نے سُنائی۔ ڈاکٹر صاحب کو ترنم پسند آیا۔ پروگرام میں میرا نام شامل کر لیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ وتیرہ تھا کہ وہ کسی بھی شخص کو کوئی کام تفویض کرنے سے پہلے اطمینان حاصل کرتے تھے۔ میں نے افتتاحیہ جلسے میں ہزاروں لوگوں کی موجودگی میں نظم سنائی جو کافی پسند کی گئی۔ ڈاکٹر صاحب بہت خوش ہوئے اور مجھے مبارکباد دی۔ یوم محمد قلی قطب شاہ تقاریب کے سلسلے میں ڈاکٹر صاحب نے بین کلیاتی بیت بازی کا اہتمام

کیا تھا مجھے کنوینیر بنایا گیا تھا بیت بازی کی محفلیں نواب طاہر علی خان کے دولت خانہ (علی کالج) کے سبزہ زار پر منعقد کی جاتی تھیں۔ فائینل مقابلہ اندرون گنبد محمد قلی قطب شاہ منعقد ہوا تھا۔ کلیات اناث (ویمنس کالج) کی ٹیم فائینل میں آئی تھی۔ اس زمانے میں بزم اردو کلیات اناث کی مشیر ڈاکٹر ثمینہ شوکت تھیں اور صدر بزم فاطمہ نسرین" میں اردو کالج میں بی او ایل کا طالب علم تھا اور بزم اردو کا صدر بھی۔ میں پہلی دفعہ ویمنس کالج گیا تھا ڈاکٹر خلیق قنوجی جو ان دنوں نظام کالج میں بی اے کے طالب علم تھا اور شعبۂ اردو کے ترجمان "طلوع" کے ایڈیٹر تھے میرے ساتھ تھے میں نے ساتھ چلنے کے لئے کہا تھا۔ ہم دونوں کو ویمنس کالج کے اسٹاف روم میں بٹھایا گیا اسٹاف روم میں ڈاکٹر ثمینہ شوکت سے ملاقات ہوئی اور میں نے اپنے آنے کی وجہ تبلائی اور کہا کہ بیت بازی کے بین کلیاتی مقابلے جو یوم محمد قلی قطب شاہ کے سلسلے میں منعقد ہو رہے ہیں میری خواہش ہے کہ ان میں ویمنس کالج کی ٹیم بھی شرکت کرے اُس وقت آرٹس کالج (عثمانیہ یونیورسٹی) کے علاوہ شہر کے ... کالجس کی ٹیموں نے اپنا نام بیت بازی مقابلے کے لئے رجسٹر کروایا تھا۔ ڈاکٹر ثمینہ شوکت نے مجھ سے تعاون کیا اور فاطمہ نسرین جو اُس وقت بی اے فائینل کی طالبہ تھیں اور صدر بزم اردو بھی تھیں بلوایا اور ہم سے تعارف کروایا۔ اردو ہال اور علی کالج میں منعقدہ مقابلۂ بیت بازی میں ویمنس کالج کی ٹیم نے حصہ لیا اور اپنی بہترین صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ یہ ٹیم فائینل میں آگئی اندرون گنبد محمد قلی قطب شاہ بیت بازی کا فائینل مقابلہ ہوا۔ پیروفیسر ... نانہ

آزاد نے علامہ اقبال کی غزل کا پہلا مصرعہ پڑھا اور اس طرح بیت بازی کا آغاز ہوا۔ اس مقابلے میں ویمنس کالج کی ٹیم نے کامیابی حاصل کی اور افتتاحیہ جلسے میں انعامات کی تقسیم عمل میں لائی گئی۔ افتتاحیہ تقریب کا آغاز ۵ بجے شام میں ہوا تھا انعامات کی تقسیم ہوئی۔ ڈاکٹر ثمینہ شوکت کی خواہش کے مطابق مجھے اختتامی تقریب کے بعد ویمنس کالج کی طالبات کو اپنے ساتھ شہر لے جانا تھا یہ تمام لڑکیاں افضل گنج بس اسٹانڈ میری رہبری میں اتریں۔ وہاں سے وہ رکشاؤں کے ذریعہ اپنے اپنے گھر چلی گئیں۔ سب سے آخر میں جانے والی فاطمہ نسرین تھیں ان کے ہمراہ ان کی چھوٹی بہن فرخ تھی جب ان لڑکیوں کے ذریعہ میرے اس حسن انتظام کی خبر ڈاکٹر ثمینہ شوکت کو ہوئی تو وہ بہت خوش ہوئیں۔ ڈاکٹر ثمینہ شوکت نے مجھ سے یہ کہا تھا کہ لڑکیوں کو گولکنڈہ بھیجنا ایک مسئلہ تھا ان کے والدین اجازت نہیں دے رہے تھے اور کہا کہ میں آپ کی ذمہ داری پر بھیج رہی ہوں۔ ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ میں یوں ہی ادارۂ ادبیات اردو چلا گیا تھا ڈاکٹر زور سے ان کے مکان کے سبزہ زار پر ملاقات ہوئی ڈاکٹر صاحب کرسی پر تشریف فرما تھے سامنے ایک ٹیبل تھا اور اس کے مناسبت ؟ کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب نے بڑی محبت سے مجھے بٹھایا اور فرمایا کہ تم ادارہ کی تقاریب میں دلچسپی لیتے رہو۔ میری یہ خواہش ہے اور فرمایا تم امتحانات میں امتیازی حیثیت سے کامیابی حاصل کرو گے تو میں تمھیں اعلیٰ تعلیم کے لئے باہر بھیج دوں گا۔" اس طرح کی حوصلہ افزائی کرنے

والے آج کہاں ہیں؟ اور اگر ہیں بھی تو بہت کم۔ ڈاکٹر زور نے بخشی غلام محمد وزیر اعلیٰ کشمیر کے زمانے میں صدر شعبۂ اردو کشمیر یونیورسٹی کی حیثیت سے فائز رہے۔ بخشی غلام محمد کی خواہش تھی کہ ڈاکٹر زور یہ عہدہ قبول فرمالیں۔ ڈاکٹر زور کچھ مہینے اس عہدہ پر فائز رہے اور وہیں پر یہ آفتاب اردو غروب ہوگیا۔ ڈاکٹر زور کے انتقال کی خبر حیدرآباد میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ میت کا انتظار کیا جاتا رہا لیکن موسم کی خرابی کی وجہ ہوائی جہاز سے میت کا لانا ممکن نہ تھا۔ وہیں درگاہ حضرت بل کے احاطہ میں تدفین عمل میں لائی گئی۔ حیدرآباد میں ہزاروں سوگواران زور کو مایوسی ہوئی ان کا آخری دیدار نہ کرسکے یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہے کہ ڈاکٹر زور کے بعد پروفیسر عبدالقادر سروری سابق صدر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ کو ڈاکٹر زور کی جگہ صدر شعبۂ اردو کشمیر یونیورسٹی مقرر کیا گیا لیکن کچھ عرصہ کے بعد ہی ان کا بھی انتقال ہوگیا سروری صاحب بھی وہیں سپرد خاک ہوئے۔ ڈاکٹر زور اپنے حیدرآبادی ہونے پر فخر محسوس کرتے تھے شمالی ہند کے بڑے بڑے مشاہیر زبان و ادب ان کی قد آور شخصیت کو تسلیم کر چکے تھے زور صاحب نے اپنی ساری زندگی باوقار انداز میں حیدرآبادی شان و آن کے ساتھ گذاری۔ ڈاکٹر زور نے حیدرآبادیوں کو یہ احساس دلایا کہ احساس کمتری اس شخص کے لئے سم قاتل ہے جو اپنے آپ کو دوسروں کے مقابلے میں کمتر سمجھتا ہے وہ کہتے تھے کہ اپنی زمین، اپنی شناخت کے لئے تادم زیست سرگرم عمل رہنا چاہیئے۔ ڈاکٹر زور کی ساری زندگی اس بات کی روشن علامت رہی کہ انسان کو اپنی طاقت کے بل بوتے جینا چاہیئے مانگے کے اجالے کو وہ اندھیرے سے تعبیر کرتے تھے۔ ڈاکٹر زور نے حیدرآباد کے قلم کاروں کو یہ احساس دلایا کہ کسی کے آگے سر نہ جھکائیں۔ ہمیشہ اپنا سر اٹھا کر چلیں۔

پروفیسر حبیب الرحمٰن

اُردو زبان و تہذیب کی نمائندہ منفرد شخصیت مجاہدِ اُردو

زبان و ادب کے تکمیل طلب مسائل آج ہی نہیں ہر دور میں رہے ہیں اور ہر زبان کے لئے رہے ہیں۔ زبان و ادب کے نام پر بہت کچھ نچھاور کرنے والے لوگوں میں اپنی زبان اور اپنی تہذیب کی بقاء و ترویج کے لئے دلیوانہ وار وابستگی کا جذبہ موجود رہتا ہے اعلیٰ مقاصد کی تکمیل کے لئے اگر قدم قدم پر رکاوٹیں حائل رہیں تو اُن کو دور کرنے کے لئے مخلصانِ تہذیب و تمدن، محبانِ زبان و ادب پیش پیش رہتے ہیں جہاں تک اُردو کا تعلق ہے ہر محبِ اُردو سے توقع نہیں رکھی جاسکتی کہ وہ جی جان سے زبان و ادب کی خدمات انجام دے گا البتہ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اعلیٰ مقاصد کی تکمیل کے لئے روز و شب منہمک رہتے ہیں پرستارانِ اُردو واقف ہیں کہ انجمن ترقی اُردو سارے ملک میں اُردو کے مسائل کی یکسوئی کے لئے کلیدی رول ادا کرتی آرہی ہے مرکزی انجمن کے علاوہ علاقائی شاخوں نے بھی زبان و ادب کے لئے بہت کچھ کیا ہے۔ اس سلسلے میں یہ کہنے

یہیں حق بہ جانب ہیوں کہ مرکزی انجمن ترقی اردو کی طاقت کو بڑھانے کے لیے علاقائی انجمنوں کی کارکردگی کا رول بھی اہم ہوتا ہے۔ یہ بات بھی صاف ہے کہ ہر تحریک کو آگے بڑھانے کے لئے کچھ ہی لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کے دم سے سرگرمیاں جاری رہتی ہیں۔ حیدرآباد میں اردو زبان کے تحفظ و نفاذ اور اس کے مختلف النوع مسائل کی یکسوئی کے لیے انجمن ترقی اردو نے مولوی حبیب الرحمٰن کی سرکردگی میں نمایاں کام انجام دیا ہے مولوی صاحب نے نادم زیست اردو کے ایک سچے ہمدرد، بہی خواہ، اور بے لوث مجاہد کی حیثیت سے نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ جس زمانے میں حبیب الرحمٰن صاحب انجمن کے معتمد تھے اس زمانے میں اردو کے نت نئے مسائل کی یکسوئی کے لیے انجمن کو کچھ زیادہ ہی متحرک ہونا پڑا تھا حبیب الرحمٰن صاحب نے انجمن ترقی اردو کی سرگرمیوں کو جاری رکھنے کے لیے اپنی زمین کا عطیہ دے کر فراخ دلی کا ثبوت دیا۔ آج جس جگہ اردو ھال، اور حبیبیہ اردو کالج، اردو آرٹس کالج قائم ہیں وہ جگہ مولوی حبیب الرحمٰن کی عطا کردہ ہے آج اردو ھال گلشن حبیب کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے مولوی حبیب الرحمٰن کے زمانے میں انجمن ترقی اردو کی سرگرمیاں کافی عروج پر تھیں جنھیں عابد علی خاں صاحب جیسے شریک معتمد، ڈاکٹر حسینی شاہد اور سری نواس لاہوٹی جیسی شخصیتوں کا بھرپور تعاون حاصل تھا۔ جس زمانے میں لسانی بنیادوں پر ریاستوں کی تقسیم جدید عمل میں آئی تو ریاست حیدرآباد دکن کا نام آندھرا پردیش کے نام سے موسوم ہو گئی۔ اردو زبان، اردو تہذیب کا جو ماحول حیدرآبادیوں کے لئے مہیا تھا اس میں مشکلات پیدا ہونے لگیں۔ حکومت آندھرا پردیش نے

اُردو زبان کے ساتھ سوتیلی ماں جیسا سلوک کرنا شروع کیا جس کی وجہ سے اردو والوں کو نئی نئی الجھنوں اور رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اُردو کے تحفظ اور تعلیم کی ترویج کے لیے حکومت کی بے اعتنائی کا مقابلہ کرنے کے لیے انجمن کو متحرک ہونا پڑا۔ اس دور کی حکومت کے سربراہوں سے مسلسل اُردو والوں کی جنگ جاری رہی۔ حکومت نے ریاستوں کی تقسیم کے وقت جو شریفانہ وعدہ کیا تھا اُس سے انحراف کیا۔ اُردو کے مسائل جوں کے توں سرد خانے کی نذر ہو گئے ناانصافی کی جاتی رہی۔ لیکن اُردو والے خاموش نہیں رہے۔ اس زمانے میں انجمن ترقی اُردو کے بے شمار جلسے ہوا کرتے تھے جن میں شہر کی نمائندہ شخصیتیں شرکت کرتی تھیں۔ مولوی حبیب الرحمٰن نے سب کا ساتھ دیا خاص طور پر عابد علی خاں صاحب کی رفاقت نے بھی انجمن کی سرگرمیوں کو مہمیز کیا۔ نواب میر احمد علی خاں سابق وزیر داخلہ حکومت آندھرا پردیش انجمن کے صدر تھے کانگریس پارٹی سے وابستہ ہونے کی وجہ سے اُردو کے بہت سے معاملات میں رہنمائی کرتے رہے جب ضرورت حکومت سے نمائندگی کرتے رہتے۔ ڈاکٹر حبیبی شاہد اور سری نواس لاہوٹی انجمن کے جلسوں میں پیش پیش رہتے تھے مولوی حبیب الرحمٰن نے اُردو ھال کے قیام کے لئے نہ صرف اپنی زمین کا عطیہ دیا بلکہ اس کی تعمیر اور ترقی کی سرگرمیوں میں بھی کافی دلچسپی لی۔ مولوی حبیب الرحمٰن صاحب کی معتمدی کے زمانے میں پی وی نرسمہا راؤ وزیر تعلیم تھے جو اُردو والوں کے لئے ہمیشہ مشکلات پیدا کرتے تھے۔ بعض وقت ایسا بھی ہوا کہ ان سے مولوی حبیب الرحمٰن صاحب کو اُلجھنا پڑا۔ پی وی نرسمہا راؤ کا ذہن اُردو والوں کے لئے صاف نہیں تھا۔ اُردو

زبان کی ترقی و تحفظ کے ہر مسئلہ پر ناانصافی کو وہ اپنا نصب العین بنا چکے تھے لیکن اردو والوں نے ہمت نہیں ہاری۔ مولوی حبیب الرحمٰن کا ایک اہم کارنامہ اورینٹل اردو کالج اور اردو آرٹس کالج کا قیام ہے ان دو کالجس سے بہت سے طلباء نے اردو میں تعلیم حاصل کر کے اپنے مہذب ہونے کا ثبوت دیا۔ انجمن ترقی اردو کے انتظامیہ کے تحت پہلے اورینٹل اردو کالج قائم ہوا اور اس کے دو تین سال بعد اردو آرٹس کالج کی اجازت ملی۔ حکومت نے اورینٹل اردو کالج کے قیام سے پہلے ہندی کالج کے قیام کی اجازت دی تھی۔ بہ الفاظ دیگر ہندی کالج کے قیام کے سبب اردو کالج کا قیام عمل میں لایا گیا۔ مولوی حبیب الرحمٰن جامعہ عثمانیہ میں معاشیات کے پروفیسر تھے بی اے میں آپ کی کتاب اصول معاشیات شامل نصاب رہی۔ وظیفہ حسن خدمت کے بعد انجمن ترقی اردو کے کاموں میں دلچسپی لینی شروع کی اور زبان و ادب کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیا۔ کالج کی سرگرمیوں کی تشہیر کے سلسلے میں روزنامہ سیاست نے بہت بڑا تعاون کیا۔ جناب عابد علی خان صاحب نے بھی انجمن کی سرگرمیوں کو فروغ دینے کے لئے شخصی دلچسپی لینی شروع کی۔ اردو ہال کی تعمیر کے لئے جب مالیہ کی ضرورت لاحق ہوئی تو انہوں نے خطیر رقم کا انتظام کیا اپنے اثر و رسوخ کو کام میں لاتے ہوئے عطیات وصول کئے۔ آج اورینٹل اردو کالج اور اردو آرٹس کالج کامیابی کے ساتھ چل رہے ہیں اردو کالج کی طالب علمی کے زمانے میں اور ادارۂ ادبیات اردو مجلس کی سرگرمیوں کے سلسلے میں مجھے مولوی حبیب الرحمٰن کو بہت قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا جس سے ان کی شخصیت کے

مختلف پہلو میرے سامنے آگئے۔ مجھے مولوی حبیب الرحمٰن کو اُردو ہال اور کالج کے ماحول میں دیکھنے کا اتفاق ہوا کرتا تھا۔ میں انجمن ترقی اردو کی سرگرمیوں سے استفادہ کرتا رہا۔ انجمن کے تمام جلسوں میں شرکت کرتا تھا۔ مولوی حبیب الرحمٰن کے زمانے میں اُردو کے بے شمار جلسے ہوتے رہے۔ اُردو کی بڑی بڑی شخصیتوں کے خیر مقدمی جلسے ہوتے تھے۔ میں نے انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام منعقدہ جلسوں میں پنڈت آنند نرائن ملا صدر انجمن ترقی اردو کو مخاطب کرتے ہوئے دیکھا ہے پروفیسر رشید احمد صدیقی اور پروفیسر سید احتشام حسین کے خیر مقدمی جلسے میں بھی شریک رہا ہوں۔ صدر جمہوریۂ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین اور فخر الدین علی احمد صاحب کے خیر مقدمی جلسوں میں بھی مجھے شرکت کرنے کا موقع ملا۔ دلیپ کمار اور دیگر فلمی اداکاروں کو اُردو ہال کے جلسوں میں دیکھ چکا ہوں اُس دور میں جتنے مشاہیر اُردو حیدرآباد آتے۔ انجمن ترقی اُردو کی جانب سے اُن کے خیر مقدمی جلسے ہوا کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے فلمی اداکارہ سادھنا نے بھی ایک جلسے میں شرکت کی تھی مولوی حبیب الرحمٰن نے مجھے اُردو مجلس کا سکریٹری نامزد کیا تھا اُس وقت رائے جانکی پرشاد اُردو مجلس کے صدر تھے جانکی پرشاد صاحب کے بعد مولوی حبیب الرحمٰن اُردو مجلس کے صدر رہے۔ اُردو مجلس کے پروگراموں کو قطعیت دینے کے سلسلے میں اکثر اوقات مولوی حبیب الرحمٰن سے ملاقات کا موقع ملتا تھا۔ میں ۱۸ برس تک اُردو مجلس کا معتمد رہا۔ میری معتمدی کے زمانہ میں پابندی کے ساتھ جلسے منعقد ہوتے تھے۔ مولوی حبیب الرحمٰن کی یہ خواہش رہتی تھی کہ اُردو مجلس کے جلسے بہتر سے بہتر انداز میں ہوتے رہیں

میری معتمدی کے ۱۸ برسوں میں بے شمار جلسے ہوتے رہے مولوی حبیب الرحمن میری کارکردگی سے بے حد مطمئن تھے۔ میں نے کبھی انہیں شکایت کا موقع نہیں دیا۔ میں اورینٹل اردو کالج کا طالب علم تھا اور اورینٹل اردو کالج کی بزم اردو کا صدر بھی تھا میری اردو زبان و ادب سے دلچسپی کا مولوی حبیب الرحمن کو اندازہ تھا میں اپنی طالب علمی کے زمانے میں اردو مجلس کے جلسوں میں نہایت پابندی سے شرکت کرتا تھا۔ منظور احمد منظور معتمد اردو مجلس تھے۔ ان کی خواہش پر اردو مجلس کے جلسوں میں تعاون کرتا تھا جانکی پرشاد صاحب مجھ سے خواہش کرتے تھے کہ میں اردو مجلس کی سرگرمیوں میں دلچسپی لیتا رہوں۔ منظور احمد منظور جب اردو مجلس کے معتمد نہیں رہے تو نواب یسین علی خان کو معتمد اردو مجلس نامزد کیا گیا ان کے بعد کچھ مہینوں کے لیے میر حسن صاحب اردو مجلس کے معتمد رہے پھر ان کے بعد میں اور فاطمہ عالم علی خان تقریباً چھ ماہ معتمدین رہے۔ فاطمہ عالم علی خان کے بیرون ملک کے دورہ کی وجہ سے اردو مجلس کی معتمد باقی نہیں رہیں۔ ان کے بعد سے میں تنہا معتمد رہا۔ مولوی حبیب الرحمن اردو مجلس کے جلسوں میں وقت پر تشریف لاتے تھے لیکن کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ جلسہ شروع ہونے سے قبل جلسہ گاہ میں انہیں بلانے کے لیے ان کے گھر جاتا۔ جلسے میں وہ اپنی بیگم صاحبہ کو اپنے ساتھ لاتے تھے ڈاکٹر زینت ساجدہ بھی اردو مجلس اور انجمن کے جلسوں میں پابندی سے شرکت کرتی تھیں اردو ہال میں داخل ہونے سے پہلے مولوی حبیب الرحمن اور ان کی بیگم صاحبہ سے ملنے کے لیے ان کے گھر جاتیں اور ان کے ساتھ اردو ہال آتی تھیں۔ مولوی حبیب الرحمن

کا نام بھی ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کی طرح روشن رہے گا۔
ڈاکٹر زور کے تذکرہ کے ساتھ مولوی حبیب الرحمن کا نام بھی باقی رہے گا۔
جس طرح ڈاکٹر زور نے ادارہ ادبیات اردو کے قیام اور اس کی ترقی میں
اپنے آپ کو وقف کیا تھا اسی طرح مولوی حبیب الرحمن نے بھی انجمن ترقی
اردو کی سرگرمیوں کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا عابد علی خان صاحب
سیاست اخبار کی مصروفیات کی وجہ سے انجمن کی سرگرمیوں کے لئے زیادہ وقت
نہیں دے سکتے تھے جب وہ انجمن سے بے تعلق ہوئے تو اس وقت وہ نائب صدر
انجمن تھے ڈاکٹر حبیبی شاہد کئی برسوں تک انجمن کے معتمد اور سری نواس لاہوٹی شریک معتمد
کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ لاہوٹی صاحب انجمن کے تنظیمی امور کے ذمہ دار
تھے اضلاع کے دوروں سے دلچسپی رکھتے تھے آفس کا کام بھی پوری ذمہ داری
کے ساتھ انجام دیتے تھے۔
مولوی حبیب الرحمن اپنی زندگی کے آخری دنوں میں پاکستان چلے گئے
اور وہیں ان کا انتقال ہوا مولوی حبیب الرحمن نے پاکستان میں ایک اہم
کتاب چند یادداشتیں کے نام سے لکھی جو مشہور ہوئی۔ مولوی حبیب الرحمن
کی اردو خدمات ناقابل فراموش ہیں وہ لوگ جو اردو زبان کے لئے
دیوانہ وار سرگرم رہے ان میں سر فہرست مولوی حبیب الرحمن کا نام بھی ہے
مولوی حبیب الرحمن کو میں نے ہمیشہ جلسوں میں شیروانی اور لمبی ٹوپی پہنے ہوئے
دیکھا ہے اردو مجلس کا جلسہ ان کی اجازت کے بعد ہی شروع کیا جاتا تھا۔ میں
اعلیٰ روایات کی پاسداری کا پابند رہا کرتا تھا مولوی حبیب الرحمن صاحب

میری ادبی سرگرمیوں سے بے حد خوش تھے تب ہی تو میں ۱۸ برسوں تک اُردو مجلس کا معتمد رہا۔ مولوی حبیب الرحمن جب پاکستان چلے گئے تو ڈاکٹر حسینی شاہد اُردو مجلس کے صدر بنے۔ اُس زمانے میں جب میں اُردو کالج کا طالب علم تھا تو کبھی کبھی حبیب الرحمن صاحب پرنسپل اور بیتل اُردو کالج پروفیسر ابوظفر عبدالواحد سے ملاقات کے لئے تشریف لاتے تھے۔ مولوی حبیب الرحمن نہایت وضع دار انسان تھے اُردو زبان اور تہذیب سے انھیں والہانہ وابستگی تھی تادم زیست اُردو کا کام کرتے رہے۔ اُردو کالج کے زیر اہتمام ہونے والی ادبی و تہذیبی تقاریب میں لازماً شریک رہتے تھے پنڈت جواہر لال نہرو نے اُردو ہال کا افتتاح کیا تھا اس وقت انجمن کے صدر ڈاکٹر سید عبدالمنان ہیں اور معتمد عبدالرحیم خان صاحب پرنسپل اُردو آرٹس کالج ہیں۔ مولوی حبیب الرحمن صاحب ادبی ٹرسٹ کے بانیوں میں سے ایک ... تھے ادبی ٹرسٹ کے ٹرسٹی تھے ممتاز کالج کے علاوہ شہر کی بعض علمی، تعلیمی و ادبی انجمنوں اور اداروں سے بھی وابستہ تھے۔ مولوی صاحب اُردو مجلس کے جلسوں میں شروع سے آخر تک تشریف فرما رہتے تھے مولوی حبیب الرحمن صاحب جیسی عظیم شخصیت کے زیر سایہ کام کرنا اعزاز کی بات تھی۔ مولوی حبیب الرحمن کی طرح استادِ محترم ڈاکٹر حسینی شاہد نے بھی ہمیشہ میرے کام کو سراہا۔ مولوی حبیب الرحمن جیسی شخصیتیں برسوں میں پیدا ہوتی ہیں حقیقت تو یہ ہے کہ مولوی حبیب الرحمن اُردو زبان اور تہذیب کی بقاء کے لئے وقف ہو چکے تھے۔ خدا مولوی حبیب الرحمن کی لحد کو خوشبوؤں سے معمور کر دے۔ ہم یہی دُعا کر سکتے ہیں ▲

پروفیسر عبدالقادر سروری

نامور استادِ جامعۂ عثمانیہ ۔ ممتاز محقق

حیدرآباد کے علمی و ادبی حلقوں میں جہاں کہیں بھی ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ کا تذکرہ ہوگا وہاں کسی نہ کسی طرح پروفیسر عبدالقادر سروری کا بھی نام لیا جائے گا۔ دونوں نام برسوں ایک ساتھ چلتے رہے۔ آج بھی علمی و ادبی محفلوں میں یہ روایت باقی ہے پروفیسر عبدالقادر سروری بھی ڈاکٹر زور کی طرح زبان و ادب کی خدمت کے لئے سرگرم عمل رہے۔ لیکن ڈاکٹر زور کے مقابلے میں سروری صاحب کی علمی و ادبی مصروفیات ان کی اپنی افتادِ طبع کے سبب کم کم رہیں۔ پروفیسر سروری ۲۱ سے زائد کتابوں کے مصنف ہیں جن میں کچھ یہ ہیں۔ زبان اور علم زبان۔ اُردو کی ادبی تاریخ اُردو مثنوی کا ارتقاء، جدید اُردو شاعری، زادِ ... کا کھول اور دیگر افسانے وغیرہ۔ اس کے علاوہ عرصۂ دراز تک مجلہ جامعہ عثمانیہ کے مدیرِ اعلیٰ بھی رہے۔ ڈاکٹر زورؔ نے اپنی سرگرمیوں کو کافی وسعت دی تھی۔ ادارۂ ادبیاتِ

اردو کا قیام اور اس کے کام کو آگے بڑھانے میں سروری صاحب بھی اس دور کے دوسرے مشاہیر زبان و ادب کی طرح ڈاکٹر زور سے کافی تعاون کیا کرتے تھے کچھ اہل قلم حضرات کا یہ خیال ہے کہ بعض علمی و ادبی معاملات میں ڈاکٹر زور اور سروری صاحب میں تعلق باہمی اختلاف تھا سروری صاحب بھی اپنے ہم عصر اردو کے خدمت گذاروں کی طرح زبان و ادب کے لئے دلچسپی لیا کرتے تھے تصنیف و تالیف کا کام جاری رہتا۔ سروری صاحب نے جہاں ایک اچھے استاد کی حیثیت سے ظاہر نام کمایا وہیں انھوں نے ایک ادیب، محقق اور نقاد کی حیثیت سے بھی شہرت حاصل کی۔ پروفیسر سروری سحر کیانی شخصیت کے مالک تھے وہ صدر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ کی حیثیت سے بھی شہرت رکھتے تھے جامعہ عثمانیہ سے وابستہ ہونے سے قبل وہ میسور یونیورسٹی میں شعبۂ اردو فارسی اور عربی کے صدر تھے۔ اُس زمانے کے بہت سے طالب علم تعلیمی میدان میں کافی اہمیت کے حامل رہے ہے۔

پروفیسر سروری کو شعر و ادب سے کافی لگاؤ تھا انھوں نے اپنے طور پر انجمن مصنفین عثمانیہ قائم کی تھی۔ اس انجمن کے تحت ان کی رہائش گاہ واقع حمایت نگر میں ہر ماہ ادبی اجلاس اور مشاعرے ہوتے تھے منتخب اساتذہ کرام، نمائندہ شعرا و ادباء مدعو رہتے تھے بعض ہونہار طلباء بھی شریک محفل رہتے تھے بہت ہی عمدہ عصرانہ ترتیب دیا جاتا تھا۔ حُسنِ اتفاق سے مجھے بھی یہ اعزاز حاصل رہا کہ میں اُن کی محفلوں میں شاعر کی حیثیت سے شرکت کرتا تھا اُس زمانے میں ابو الفیض سحر نے فضا کے نام سے ایک ادبی رسالہ شائع کیا تھا

پروفیسر صاحب کے کئی شاگرد بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے ہیں۔
سروری صاحب کا ایک اہم کارنامہ بین الکلیاتی اُردو فیسٹول کا انعقاد ہے شاید ہی ملک کی کسی یونیورسٹی میں اس طرح کا اُردو فیسٹول ہوا ہوگا سروری صاحب کی رارت نگرانی میں ۱۹۵۹ء میں عظیم الشان پیمانے پر سہ روزہ بین کلیاتی اُردو فیسٹول کا اہتمام کیا گیا تھا یہ تقاریب نظام کالج گراونڈ پر منعقد ہوئی تھیں۔ اُردو آرٹس کالج جامعہ عثمانیہ کے طالب علم مسعود معین اُردو فیسٹول کے صدر منتخب ہوئے تھے اور الطاف حسین معتمد ان تقاریب میں شعبۂ اُردو جامعہ عثمانیہ کے طلباء کے ساتھ جامعہ عثمانیہ سے ملحقہ تمام کالجس کے طلباء و طالبات وابستہ رہتے تھے۔ طریقہ کار کے مطابق ہر کالج کے صدور بین کلیاتی اُردو فیسٹول کے مختلف شعبوں سے وابستہ ہو جاتے تھے اُردو فیسٹول کے تحت کل ہند مشاعرہ کا انعقاد عمل میں لایا جاتا۔ جس میں ملک کے نامور شاعروں کو مدعو کیا جاتا تھا۔ ۱۹۵۹ء میں منعقدہ اُردو فیسٹول کے مشاعرہ میں مجروح سلطان پوری، ساحر لدھیانوی، جاں نثار اختر اور دوسرے شاعر مدعو تھے ہیں اُس اُردو فیسٹول مشاعرہ کا کنونیر مقرر ہوا تھا حقیقت تو یہ ہے کہ اُردو فیسٹول کا سب سے زیادہ متاثر کرنے والا شعبہ مشاعرہ ہی تھا ویسے محفلِ موسیقی کا اہتمام بھی کیا جاتا تھا۔ تمام صدور نے بزم کا ایک اجلاس تمام شعبوں کے معتمدین کے انتخاب کے سلسلے میں زیر نگرانی سرپرست اُردو فیسٹول سروری صاحب ہوا تھا۔ جناب منظور احمد منظور لکچرار اُردو کالج مشاعرہ کے مشیر تھے۔ اسی طرح محفلِ موسیقی کے مشیر

بعد وہیں انتقال کر گئے اور وہ بھی کشمیر کی مٹی میں مل گئے۔ یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ اردو کی دو بڑی قد آور شخصیتوں کی آخری آرام گاہ کشمیر میں ہے سروری صاحب کے زمانے میں حیدر آباد میں بہت سے اہم اور قابلِ قدر و منزلت مشاہیرِ اردو زبان تھے جیسے ڈاکٹر زور، پروفیسر ہارون خان شروانی، مولوی حبیب الرحمٰن، پروفیسر سعید محمد رائے جانکی پرشاد، ڈاکٹر مجید صدیقی، پروفیسر اکبر الدین صدیقی پروفیسر ابو ظفر عبد الواحد وغیرہ۔ ان کے بعد کا دور بھی قابلِ ذکر ہے دنیا یوں ہی چلتی رہتی ہے لیکن یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ ہر دور میں کچھ ہی لوگ ایسے ہوتے ہیں جو منفرد مقام کے حامل رہتے ہیں یہ اور بات ہے کہ اس دور کا ہر قلمکار اپنی عظمتوں کے ساتھ سرخ رو رہا ہے جس کی بات اس کے ساتھ رہتی ہے ایسا ہی ہوتا چلا آرہا ہے پروفیسر سروری اکثر دفعہ شیروانی زیب تن کرتے تھے اندازِ گفتگو مقابل کو متوجہ کرتا تھا بہت ہی عالمانہ انداز کا لب و لہجہ تھا ان کے ادبی مضامین اور ان کی تقریریں پُر مغز ہوتی تھیں۔ ہمیشہ علمی و ادبی کاموں میں مصروف رہتے تھے سروری صاحب کا شمار جامعہ عثمانیہ کے قابل ترین اساتذہ میں ہوتا تھا سروری صاحب نے اپنے کئی طالب علموں میں صحیح شعری و ادبی ذوق پیدا کیا۔ سروری صاحب اپنی ادبی انجمن میں جامعہ عثمانیہ سے وابستہ نوجوان اہلِ قلم اور شہر کے نوجوان لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کے لئے مدعو کرتے تھے سروری صاحب کی عنایت سے میں نے بھی کئی مشاعروں میں کلام سنایا

پروفیسر مغنی تبسم بھی شعبۂ ڈرامہ کے مشیر حمید شطاری صاحب تھے اس فسیٹول کے بہترین انعقاد اور سرگرمیوں کی پیش رفت کے لئے سروری صاحب کی رہائش گاہ کا ایک حصہ کو فسیٹول کا آفس بنایا گیا تھا سروری صاحب کے مکان پر وقتاً فوقتاً اجلاس ہوا کرتے تھے بغیر کسی رکاوٹ کے ادبی و تہذیبی تمام سرگرمیاں جاری رہتیں۔ خواتین اور طالبات کی ایک بڑی تعداد شریک تقاریب رہتی تھی۔ میں سروری صاحب کا شاگرد تو نہیں تھا لیکن ہمیشہ ایک استاد کی طرح اُن کی تعظیم کرتا تھا سروری صاحب انجمن ترقی اُردو کے ادبی جلسوں میں بھی تشریف لایا کرتے تھے انہوں نے ادارۂ ادبیات اُردو اور انجمن ترقی اُردو کے کئی جلسوں کو مخاطب کیا ہے سروری صاحب جامعہ عثمانیہ کے صدر شعبہ کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے تو وہ علمی و ادبی کاموں میں زیادہ مصروف رہنے لگے۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ کو وزیر اعلیٰ کشمیر بخشی غلام محمد کی شخصی دلچسپی کی وجہ سے صدر شعبۂ اُردو کشمیر یونیورسٹی مقرر کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر زورؔ کشمیر تشریف لے گئے مگر دکن کی خاک سرزمین کشمیر کا حصہ بن گئی۔ بدقسمتی سے موسم کی خرابی کی وجہ سے ان کی نعش حیدرآباد نہیں لائی جاسکی اور وہ وہیں درگاہ حضرت بل کے احاطہ میں دفن کیئے گئے زورؔ صاحب کے بعد سروری صاحب کا انتخاب کشمیر یونیورسٹی کے صدر شعبۂ اُردو کی حیثیت سے ہوا۔ سروری صاحب کشمیر جانے کے لئے تیار نہیں تھے اپنے رفقائے کار سے مشورہ کرتے رہے کہ کشمیر جاؤں کہ نہ جاؤں آخرکار انہوں نے کشمیر کے لئے رخت سفر باندھ لیا۔ لیکن سروری صاحب بھی کچھ عرصہ

ہے اور ان کی بزم کا بعض دفعہ ناظم مشاعرہ بھی رہا۔ اُن کی محفل میں اس دور کے تمام اہم شاعر شرکت کرتے تھے نظام کالج کے استاد ہادی القادری کو بھی میں نے پہلی دفعہ وہیں سنا تھا۔ اس زمانے میں جامعہ عثمانیہ کے اساتذہ میں ڈاکٹر غلام دستگیر رشید بیشتر مشاعروں میں کلام سناتے تھے ان کی ایک اپنی پسندیدہ غزل تھی جس کی ردیف تھی الیسے تو پہ ان سے طلباء اور سامعین اصرار کر کے سنتے تھے وہ دور شعر وادب کی محفلوں کے لئے خوشگوار تھا اب نہ ویسی شعر وادب کی محفلیں سجتی ہیں اور نہ ہی اس طرح کی سرگرمیاں جاری ہیں نہ تو ویسے سخن شناس باقی رہے اور نہ ہی ویسے شعراء۔ پھر بھی آج اُردو کے کچھ شیدائی ایسے موجود ہیں جو اُردو زبان وادب کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں سروری صاحب کے ساتھ انڈو آرٹس کالج میں کام کرنے والے قابلِ ذکر اساتذہ کے کچھ نام یہ ہیں پروفیسر سید محمد، ڈاکٹر حفیظ قتیل، پروفیسر غلام عمر خان پروفیسر رفیعہ سلطانہ، ڈاکٹر حمید شطاری اور اختر شاہ خان وغیرہ۔

سروری صاحب آج ہم میں نہیں ہیں لیکن ان کا نام آج بھی اُردو ادب میں، اُردو کی محفلوں میں زندہ ہے سروری صاحب جیسی بہت سی باکمال شخصیتیں ہمارے شہر میں رہی ہیں جن پر بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے ان مشاہیر دکن کی خدمات کو اُجاگر کرنے کے لئے اہل قلم حضرات کو آگے آنا چاہیئے۔ خدا کرے کہ ہمارے شہر کے ادیب و تذکرہ نگار عصر حاضر کے قلم کاروں کی خدمات پر خامہ فرسائی کرتے ہوئے اپنا اسلاف کی یاد دل

کو اپنی تحریروں کا وسیلہ بنائیں۔

یہاں اس بات کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا کہ ادارۂ میرا شہر میرے لوگ کی جانب سے اوراقِ ماضی کے زیرِ عنوان کئی جلسے منعقد ہوئے ہیں جن میں حیدرآباد کی نامور شخصیتوں کے کارناموں کو بھرپور خراج پیش کیا گیا پروفیسر سروری صاحب کی یاد کو تازہ کرنے کی غرض سے اس ادارہ نے کچھ عرصہ قبل اردو ہال میں جلسہ کا اہتمام کیا تھا۔

پروفیسر ابوظفر عبدالواحد

باکمال صاحبِ فکروفن۔ قابل ترین استاد

ہر ایک طالب علم کی طالبانہ زندگی میں کچھ ایسے ناقابلِ فراموش اساتذہ بھی رگِ جاں کے قریب رہتے ہیں جن کو طالب علم زندگی بھر نہیں بھلا سکتے اور جن کو زندگی کے ہر ارتقائی موڑ پر ان اساتذہ کے احسانات یاد آتے ہیں۔ خاص طور پر بہترین اساتذہ اُس وقت زیادہ یاد آتے ہیں جب ایک طالب علم اعلیٰ ڈگریاں حاصل کر کے اپنے روشن مستقبل کی تلاش میں نکل جاتا ہے جیسے جیسے وہ ترقی کرتا جاتا ہے ویسے ویسے اساتذہ کی کرم فرمائیاں اُس کے دل و دماغ کو جھکاتی رہتی ہیں کچھ اساتذہ اس قدر شفیق ہوتے ہیں کہ ان سے طالب علم کو والہانہ دلبستگی ہو جاتی ہے طریقۂ تعلیم و تربیت سے ہٹ کر بھی ان کی شخصیت طلباء کو متاثر کرتی ہے۔ ابتدائی تعلیم کے زمانے میں مجھے میرے تایا حیدر علی مرحوم کی تربیت حاصل تھی جب میں وسطانیہ جماعت کا طالب علم تھا تو میرے اساتذہ میں بہت ہی

عزیز ترین استاد نبی الحسن صاحب تھے جو میرے وطن ہمنا آباد میں مڈل اسکول کے صدر مدرس تھے نبی الحسن صاحب اسکول سے متصل مکان میں رہتے تھے وہ دیوبند کے فاضل تھے مظفر نگر اُن کا وطن تھا اردو، فارسی، عربی کے جید عالم تھے۔ کلاس میں میری اُردو تعلیمی حالت سب سے بہتر تھی۔ ساتویں جماعت کامیاب کرنے کے بعد ہمنا آباد میں رہ کر میں نے منشی نظامیہ کا امتحان دیا اور امتیازی حیثیت سے کامیابی حاصل کی۔ اُس وقت ہمنا آباد میں صرف ایک مڈل اسکول تھا اس کے بعد کی تعلیم کے لئے طلبا حیدرآباد کا رُخ کرتے تھے نبی الحسن صاحب نے مجھے منشی کی بہترین تعلیم دی میں منشی کامیاب ہوا۔ مزید تعلیم کے لئے حیدرآباد آیا علی گڈھ مسلم یونیورسٹی سے میٹرک کامیاب کیا منشی فاضل کے امتحان کے لئے ادارۂ شرقیہ میں تعلیم پائی۔ مولانا گیلمی کا شاگرد خاص رہنے کا اعزاز حاصل ہوا (جو) کا ادارہ اُردو گلی پتھر گٹی میں واقع تھا جب میں نے اورینٹل اُردو کالج میں بی۔ اے۔ اول میں داخلہ لیا تو اُس وقت پروفیسر ابوظفر عبدالواحد کالج کے پرنسپل تھے جہاں وہ انگریزی، اُردو اور فارسی پڑھاتے تھے۔ ڈاکٹر حسینی شاہد، ڈاکٹر زینت ساجدہ ڈاکٹر مغنی تبسم، منظور احمد اور سعادت نذیر میرے اساتذہ تھے جو اعزازی خدمات انجام دے رہے تھے بی اے اول کلاس میں ۲۵، ۳۰ طلباء تھے پروفیسر ابوظفر عبدالواحد کا میں منظورِ نظر شاگرد رہا۔ جب میں کالج میں داخلہ لیا تو اُس وقت تین چار کمروں پر مشتمل یہ کالج اُردو ہال

کے احاطہ میں تھا اُس وقت انٹرنس۔ ڈپ او۔ ایل کی کلاسس بھی ہوتی تھیں چونکہ میں اُردو فاضل، منشی فاضل و ادیب کامل کامیاب کر چکا تھا اس لیے مجھے بالراست پی او ایل (مماثل بی۔ اے) میں داخلہ مل گیا۔ ظفر صاحب وقت پر کالج تشریف لاتے تھے۔ ان کے پڑھانے کا انداز اس قدر دلکش تھا کہ کوئی طالب علم بھی ان کی کلاس میں غیر حاضر نہیں رہتا تھا۔ نہایت عمدگی سے بہت ہی اچھے موڈ میں درس دیا کرتے تھے لیکچر کے دوران اُردو کے بہترین شعر سناتے تھے۔ طلباء کو علم عروض بھی سکھاتے تھے ظفر صاحب نے کبھی بیٹھ کر کلاس نہیں لی۔ ہمیشہ ٹہلتے ہوئے کلاس لیتے تھے پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ کب ان کا پیریڈ ختم ہوتا ہے۔ تمام طلباء پر مشفقانہ نظر رکھتے تھے۔ مجھے شعر و سخن کا ذوق تھا وہ میری ابتدائی شاعری کا زمانہ تھا ظفر صاحب میری غزلیں سن کر حوصلہ افزائی کرتے تھے ظفر صاحب سے مجھ اس قدر لگاؤ تھا کہ میں ہفتہ میں کم از کم دو تین بار اُن کے دولت خانہ واقع اعظم پورہ پہونچتا تھا جیسے ہی میں کال بیل دیتا وہ تشریف لاتے اور بڑی شفقت سے بیٹھنے کے لئے کہتے۔ مجھ سے میرا کلام سنتے۔ اُن کی خواہش رہتی کہ میں ترنم میں ان کو کلام سناؤں۔ اُس زمانے میں علم عروض پر ان کی ایک مایہ ناز کتاب تکمیل پا رہی تھی کچھ حصے مجھے سُناتے تھے۔ آہنگِ شعر کے نام سے ایک ضخیم کتاب اردو اکیڈیمی آندھرا پردیش سے ۱۹۷۹ء میں شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب میں مثال کے طور پر میری نظموں کے کچھ مصرعے شامل کئے

گئے ہیں ۔ آہنگ شعر ظفر صاحب کی ادبی زندگی کا حاصل ہے اُسی زمانے میں میرا پہلا مجموعۂ کلام گلِ تازہ شائع ہوا تھا میں نے کتاب میں کسی بھی دانشور کی نہ تو رائے شامل کی اور نہ ہی دیباچہ لکھوایا۔ حالانکہ روایت تھی کہ کتابوں میں کسی بڑے ادیب، نقاد یا شاعر کا پیش لفظ شامل رہے کتاب میں صرف غزلیں ہی شامل ہیں۔ گلِ تازہ کی ترتیب و تزئین کے موقع پر مجھے میری بہن صالحہ الطاف کا مشورہ حاصل رہا۔ اس مجموعۂ کلام میں کچھ مرقعے شامل ہیں جو میری منہ بولی بہن عذرا سعید کی فنکاری کا اعلیٰ نمونہ ہیں عذرا سعید اُس وقت میٹرک کی طالبہ تھی جس نے بعد میں جامعہ عثمانیہ سے سوشیالوجی میں ایم اے کیا۔ میرے تقریباً تمام شعری مجموعوں کے سرورق کا ڈیزائن عذرا سعید کی اعلیٰ فن کاری کا شاہکار رہے ہیں گلِ تازہ بے حد مقبول ہوئی۔ گلِ تازہ کی رسم اجراء تقریب اردو مجلس کے زیر اہتمام اُردو ہال میں ہوئی تھی پروفیسر ابوظفر عبدالواحد نے رسم اجراء انجام دی تھی۔ مجموعۂ کلام ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا تھا اُس وقت شہر کے تقریباً تمام مشاہیر اُردو پروفیسر ہارون خان شیروانی، مولوی حبیب الرحمٰن عابد علی خان، محبوب حسین جگر، مخدوم محی الدین ڈاکٹر زینت ساجدہ، ڈاکٹر حسینی شاہد، رائے جانکی پرشاد، ڈاکٹر مغنی تبسم وغیرہ نے شرکت کی تھی پروفیسر ابوظفر عبدالواحد نے رسم اجراء انجام دینے کے بعد مضمون پڑھا تھا جو بعد میں صالحہ الطاف کی ادارت میں شائع ہونے والے ادبی رسالہ خاتونِ دکن میں شائع ہوا۔ ظفر صاحب نے رسمِ اجراء انجام دیتے ہوئے

اپنے شگفتہ و شستہ خطاب میں کہا تھا کہ مخدوم کی گل تر کی مقبولیت اپنی جگہ مسلم ہے لیکن گلِ تازہ کی بات کچھ اور ہے ظفر صاحب کو کتاب کا نام گلِ تازہ بہت پسند تھا میں ۶۰-۱۹۵۹ء میں ظفر صاحب کا شاگرد رہا ہوں۔ رسم اجراء تقریب کے دن ڈاکٹر سیدہ جعفر صاحبہ کا نہایت ہی عمدہ مضمون سیاست میں شائع ہوا تھا (میری تصویر کے ساتھ) سری نواس لاہوٹی صاحب بھی رسم اجراء تقریب میں موجود تھے جیسے ہی ڈاکٹر سیدہ جعفر ہال میں داخل ہوئیں انہوں نے مضمون کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ اتنے اچھے مضمون کی داد کس کو دوں۔ آپ کو یا شاعر کو۔ میں اُس وقت وہیں ٹھہرا ہوا تھا سیدہ جعفر نے کہا شاعر کو داد دیجئے۔ اچھی شاعری ہو تو اچھا مضمون لکھا جاتا ہے ظفر صاحب کے شاگردوں میں میں نے محسوس کیا تھا کہ ڈاکٹر حسینی شاہد اُن کے بہت عزیز شاگرد ہیں مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ آہنگ شعر کی اشاعت میں ڈاکٹر حسینی شاہد کی بھی دلچسپی شامل رہی ہے ظفر صاحب کو میں ہمیشہ زندہ دل، خوش مزاج اور شگفتہ طبیعت پایا۔ بہت ہی اچھے موڈ میں پڑھاتے تھے جی چاہتا تھا کہ ان کی کلاس جاری رہے۔ وقت کے ختم ہونے کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا۔ ظفر صاحب اپنے دوست سابق پرو وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جناب فضل الرحمن صاحب کے گلے میں ہاتھ ڈال کر اردو کالج کے میدان کا چکر لگاتے ہوئے گفتگو جاری رکھتے۔ اکثر وہ ظفر صاحب سے ملاقات کے لئے آتے تھے وہ ایک دوسرے

کے بے حد بے تکلف دوست تھے مولوی حبیب الرحمٰن صاحب فضل الرحمٰن صاحب کے بہنوئی تھے مولوی حبیب الرحمٰن نے اردو ہال اورینٹل اردو کالج اور آرٹس کالج کے لیے اپنی ذاتی زمین عطیہ کے طور پر انتظامیہ کو حوالے کی تھی وہ اردو ہال کے احاطہ میں ایک الگ مقام پر رہتے تھے اردو مجلس کے صدر بھی رہے اردو مجلس کے پروگرامس کو قطعیت بھی دیتے تھے مولوی حبیب الرحمٰن سے میں ملا کرتا تھا مولوی صاحب کے بعد ڈاکٹر حبیبی شاہد اردو مجلس کے صدر مقرر ہوئے۔ ظفر صاحب سٹی کالج میں بھی پڑھاتے تھے میں ظفر صاحب کے دولت خانہ پر حاضری دینے کے لیے عموماً اتوار کے دن جاتا تھا ایک گھنٹہ سے زائد ظفر صاحب کے ساتھ رہتا۔ شعر و شاعری کے بارے میں گفتگو رہتی۔ ظفر صاحب نے مجھ سے بہت ہی اہم تین باتیں کہی تھیں جو میرے دل و دماغ پر نقش بن کر رہ گئی ہیں۔ ظفر صاحب نے فرمایا تھا برخوردار۔ تین باتوں کو ضرور یاد رکھو کہ یہ تین باتیں زندگی میں بہت کام آئیں گی۔ پہلی بات یہ ہے کہ ہر انسان کی زندگی میں دس سال بہت اہم ہوتے ہیں۔ ان دس برسوں میں تم جو کچھ حاصل کر دگے زندگی بھر تمہارے کام آئے گا۔ دوسری یہ کہ تم ہمیشہ اپنے حریف کے مد مقابل رہو وہ کمزور پڑ جائے گا تیسری بات یہ کہ جب تک احساس زندہ رہتا ہے آدمی بوڑھا نہیں ہوتا۔ ہمیشہ اپنے احساس کو ترو تازہ اور جوان رکھو ظفر صاحب بے حد دلچسپ گفتگو کرتے تھے مگر ان کی ہر بات ان کے تجربہ کا نچوڑ ہوتی تھی۔ ظفر صاحب خود اچھے شاعر تھے لیکن شعر نہیں سناتے

تھے طلباء کو اپنی پسند کے دوسرے شاعروں کے شعر سناتے تھے میں نے ایک دن ظفر صاحب کی خواہش پر کالج میں اپنی غزل سنائی۔ حافظ نذیرالدین بھی میرے ہم جماعت تھے اس مختصر محفلِ شعر میں کالج کے استاد منظور احمد منظور بھی تھے۔ محفلِ شعر ختم ہونے ہی والی تھی کہ حافظ نذیرالدین کھڑے ہو کر کہنے لگے میں بھی کچھ شعر سنانا چاہتا ہوں رباعی عرض ہے۔ رباعی کے ساتھ ظفر صاحب کے کان کھڑے ہو گئے۔ حافظ نذیرالدین سے کہا برخوردار! ادھر آؤ اور قریب! اے استاذ۔ حافظ صاحب نے رباعی کے نام پر چار ساقط الجر مصرعے سنائے۔ جب پہلا مصرع سنایا تو ظفر صاحب خاموش رہے۔ دوسرے مصرع پر پہلو بدلے۔ تیسرے مصرع پر حافظ صاحب کا کان پکڑ کر کہا یہ رباعی ہے اس پر محفلِ شعر ختم ہوئی ——

ظفر صاحب آج ہم میں نہیں رہے لیکن منظور احمد صاحب سے کبھی اس موضوع پر گفتگو ہوتی ہے تو خوب لطف اٹھاتے ہیں۔ میں ظفر صاحب کا دو سال تک طالب علم رہا۔ بی۔او۔ایل کی تکمیل کے بعد ایم۔او۔ایل میں داخلہ لیا تو اس وقت اردو کالج کے پرنسپل پروفیسر سید محمد تھے۔ پروفیسر سید محمد کے بعد ڈاکٹر حسینی شاہد پرنسپل تھے۔ ظفر صاحب کالج کو رکشا میں آتے تھے کبھی کبھی منظور احمد صاحب ان کے ساتھ ہو جاتے۔ منظور صاحب کا مکان نور خان بازار میں اور ظفر صاحب کا اعظم پورہ میں تھا دونوں محلے قریب ہیں ظفر صاحب اپنی زندگی کے آخری دنوں میں

اپنے بیٹے کے ہاں پاکستان چلے گئے اور وہیں سپردِ خاک ہوئے۔ جب میں یہ مضمون ختم کر رہا ہوں تو ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ ظفر صاحب میری آنکھوں کے سامنے ہیں۔ ان کی ایک بات مجھے یاد آ رہی ہے۔ ایسے مشفق استاد، بہت کم شاگردوں کے نصیب میں ہوتے ہیں زائد از ۴۰ برس ہو رہے ہیں میں ظفر صاحب کو نہیں بھول پایا۔ ان کی یاد، ان کی شفقت، ان کی شخصیت اور ان کے مشورے میرے لئے سرمایہ حیات ہیں ایک روشن چراغ کی طرح۔ میں اس استاد کو کیسے بھول سکتا ہوں جس نے شعروادب کے ماحول میں سر اٹھا کر چلنے کا سلیقہ سکھایا۔ میں اس استاد کو کس طرح بھول سکتا ہوں جس نے خودداری، کج کلاہی، انسان دوستی اور اصول پسندی کا درس دیا تھا۔

پروفیسر سیّد محمّد

اُردو کے خاموش خدمت گذار۔ منفرد ادیب

بعض شخصیتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کے خدوخال اور جن کے اندازِ گفتگو سے ہی اُن کی علمی و ادبی عظمتوں کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ ان میں علمی و ادبی اعلیٰ صلاحیتیں بہ درجہ اتم موجود ہیں لیکن اس کے باوجود ایسی سایہ دار شخصیتیں اپنے آپ کو زندگی بھر ایک طالب علم ہی سمجھتی رہتی ہیں۔ سادگی و بردباری کی مظہر لیے نیازانہ طرزِ حیات شائستگی خیال و شگفتگی، فکروفن کی غمازی کرنے والے قابلِ قدر دانشوروں میں سید محمد صاحب بھی اپنی منفرد پہچان، اہمیت اور حیثیت کے حامل تھے پروفیسر سید محمد جامعہ عثمانیہ کے قابل ترین اساتذہ میں سے ایک رہے ہیں بیسوں طلباء آپ کے علمی فیضان سے سیراب ہو چکے ہیں مجھے یہ فخر حاصل رہا ہے کہ میں بھی پروفیسر سید محمد صاحب کا شاگرد رہا ہوں۔ میں جب اورینٹل کالج میں ایم اے کا طالب علم تھا تو اُس وقت پروفیسر صاحب اردو کالج

کے پرنسپل تھے پروفیسر صاحب جن خاص خاص طلباء کو اپنے دولت خانہ پر بھی تعلیم دیا کرتے تھے اُن طلباء میں سے ایک میں بھی تھا۔ خاص طور پر دکنی ادب کی تعلیم کے سلسلے میں میں پروفیسر صاحب کے دولت خانہ پر حاضری دیا کرتا تھا جیسے ہی میں پروفیسر صاحب کے گھر پہونچتا۔ اطلاع ملتے ہی تشریف لاتے۔ اکثر اوقات اُن کے دیوان خانے میں بعض علمی و ادبی حضرات تشریف فرما رہتے تھے۔ پروفیسر سید محمد صاحب نے بھی ڈاکٹر زور کی قیادت میں ادارۂ ادبیاتِ اُردو کے قیام اور اس کو ترقی دینے کے لئے بہت کام کیا ہے۔ پروفیسر سید محمد کئی کتابوں کے مصنف/مولف ہیں۔ ان کے بڑے بیٹے معراج محمد سیاست اخبار میں سب ایڈیٹر کی حیثیت سے برسوں کام کرتے رہے۔ پروفیسر صاحب چھتہ بازار میں واقع اپنے پریس (اعجاز پریس) میں بھی تشریف فرما رہتے تھے میرا پہلا مجموعۂ کلام "گلِ تازہ" ۱۹۶۵ء اعجاز پریس میں طبع ہوا۔ اس وقت اعجاز پریس میں شہر کے علمی و ادبی حلقوں سے تعلق رکھنے والی تقریباً تمام اہم شخصیتوں کی کتابیں چھپتی تھیں (آج بھی چھپتی ہیں) پروفیسر صاحب کے فرزند نور محمد اعجاز پریس کے مالک تھے جو عمدہ صلاحیتوں کے حامل نوجوان تھے۔ نہایت دیانت دار، قابلِ بھروسہ، فرض شناس انسان تھے اعجاز پریس میں میں نے اپنی اور مجھ سے متعلق تقریباً زائد از ۲۰ کتابیں (بہ شمول تساؤنیرس) شائع کروائی ہیں میرے قریبی شاعروں ادیبوں کی کتابیں اعجاز پریس میں چھپتی رہی ہیں آج بھی اعجاز پریس سے

ان کا رابطہ باقی ہے وقت کی پابندی واجبی اُجرت، اعجاز پریس کا طرۂ امتیاز ہے پریس کا بہت ہی پاک و صاف ماحول ہے نور محمد صاحب ایک با اخلاق شریف النفس، قابلِ اعتماد شخص تھے وہ اپنے والدِ محترم کی روایت کو باقی رکھتے ہوئے نہ صرف شاعروں، ادیبوں کے لئے ہی بہترین معاون ثابت ہوئے ہیں بلکہ اکثر اصحاب جو اعجاز پریس سے تعاون حاصل کرنا چاہتے تھے ان سے بھی ہر ممکنہ تعاون کرتے تھے پروفیسر صاحب کے تین اور بیٹے اعجاز محمد (محکمۂ تعلیمات) سید منظور محمد (ریلت ڈپارٹمنٹ) اور ممتاز محمد ہیں ممتاز محمد کا بھی پریس ہے۔ پروفیسر صاحب کے پوتے سید ریاض احمد رضوان بہترین آرٹسٹ اور خوش نویس ہیں جو اعجاز پریس سے وابستہ ہیں۔

کئی برس پہلے ایک ملاقات میں ممتاز شاعر و مدیر ماہنامہ پونم ناصر کرنولی نے بتایا کہ پروفیسر صاحب جامعہ عثمانیہ کے نہایت لائق استاد تھے جن کا شمار جامعہ عثمانیہ کے قابل ترین اساتذہ میں ہوتا ہے ناصر کرنولی نے سلسلۂ گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ جب میں جامعہ عثمانیہ میں ایم اے اردو کا طالب علم تھا پروفیسر صاحب مجھ پر بہت مہربان تھے اور کہا کہ اگر پروفیسر صاحب کا مجھے تعاون حاصل نہ ہوتا تو شاید ایم اے نہیں کر پاتا۔ دراصل میں حاضری کے معاملے میں زیادہ پابند نہیں تھا امتحان میں شرکت کے لئے متعلقہ حاضری ضروری ہوتی ہے اس طرح کا سلوک میری حد تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ اکثر طلبا ان کے حسنِ سلوک سے فیض پاتے رہے۔ پروفیسر صاحب حضرت خواجہ بندہ نواز کی

عرس شریف تقاریب کے سلسلے میں منعقدہ علمی اجلاس میں تقریباً ہر سال شرکت فرماتے تھے اپنے بہترین مضامین سے حاضرین محفل کی معلومات میں اضافہ کرتے رہے۔ میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ بعض کم آمیز سیدھے سادے لوگ بھی ان کے ساتھ رہتے تھے۔ ڈاکٹر صادق نقوی نے خورشید احمد جامی میموریل اکیڈیمی کے زیر اہتمام منعقدہ ایک ادبی اجلاس کے دوران اپنی تقریر میں کہا تھا کہ ان کے والد محترم محمد احمد حسین نقوی پروفیسر سید محمد صاحب کے قریبی دوست تھے دونوں ایک ہی محلہ سلطان پورہ میں سکونت پذیر تھے دونوں سٹی کالج میں استاد تھے بہ قول صادق نقوی پروفیسر صاحب خالص علمی و ادبی آدمی تھے۔ بزرگانِ دین کی عرس شریف تقاریب میں پابندی کے ساتھ شرکت کیا کرتے تھے تمام ہمسائے آپ کے حسنِ سلوک سے خوش اور مطمئن رہا کرتے تھے پروفیسر صاحب اردو کالج میں اعزازی پرنسپل رہے ہے پروفیسر ابو ظفر عبد الواحد بھی اعزازی پرنسپل تھے۔ پروفیسر صاحب ادارہ ادبیات اردو کی ادبی تقریبات میں حصہ لیا کرتے تھے۔ یوم محمد قلی قطب شاہ تقاریب کے سلسلے میں بھی زیادہ متحرک رہتے تھے۔ ڈاکٹر زور کے خاص رفقائے کار میں آپ کا شمار ہوتا تھا ڈاکٹر زور پروفیسر صاحب پر اعتماد کرتے تھے بلکہ اپنے علمی و ادبی دوستوں سے ادارہ کے کاموں کو آگے بڑھانے میں تعاون حاصل کیا کرتے تھے۔ ادارۂ ادبیات اردو کی خدمات علمی و ادبی حلقوں میں قابلِ فخر سمجھی جاتی ہیں پروفیسر سید محمد صاحب جیسے دیگر اساتذۂ اردو اور

اُردو یا ادب نے بھی دکنی ادب اور قطب شاہوں کے دور کے علمی و ادبی خدمات کو اجاگر کرنے میں زندگی بھر مصروف رہے ادارۂ ادبیات اُردو کے قیام کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ دکنی ادب کی تاریخ کو منظرِ عام پر لایا جائے محلہ سلطان پورہ ہی میں پروفیسر صاحب کے ایک رفیق، علمی و ادبی دوست ڈاکٹر حفیظ قتیل بھی سکونت پذیر تھے ان کے محلے سے قریب محلہ اعظم پورہ میں پروفیسر ابوظفر عبدالواحد بھی رہتے تھے۔ سلطان پورہ (نور خان بازار) میں بڑی بڑی شخصیتیں رہی ہیں فصاحت جنگ جلیل جیسے مستند استاد شاعر بھی سلطان پورہ میں رہتے تھے آج اس محلے میں ڈاکٹر حسن الدین احمد اور ڈاکٹر علی احمد جلیلی جیسی علمی و ادبی ہستیاں فروکش ہیں۔ خورشید احمد جامی اور امیر احمد خسرو جیسے نامی گرامی شاعر بھی اسی محلے میں رہتے تھے۔ پروفیسر سید محمد ایک قلندر صفت انسان تھے تبحّرِ علمی میں آپ اپنی مثال تھے رات دن علمی و ادبی کاموں میں مصروف رہا کرتے تھے اپنے دور کے لائق و فائق شخصیتوں کے ساتھ ان کی نشست و برخواست رہتی تھی پروفیسر صاحب نہایت پُروقار، معتبر استاد و ادیب تھے اس دور کی عظیم دانشوروں میں ڈاکٹر زور، مولوی حبیب الرحمن، پروفیسر ہارون خان شروانی، پروفیسر سید علی اکبر، پروفیسر عبدالقادر سروری، پروفیسر حمید صدیقی رائے جانکی پرشاد، پروفیسر ابوظفر عبدالواحد، نصیر الدین ہاشمی، پروفیسر اکبرالدین صدیقی جیسی شخصیتیں ہمارے شہر کی آبرو تھیں مجھے ان میں سے بیشتر اعلیٰ مرتبت شخصیتوں سے ملنے اور ان کی سرپرستی حاصل کرنے کا موقع ملا ہے۔

پروفیسر صاحب بلند قامت، دبلے پتلے، پھرتیلے انسان تھے آواز میں گرج تھی مخاطب کو ان کا انداز گفتگو متاثر کرتا تھا پروفیسر صاحب ان بڑی شخصیتوں میں سے ایک ہیں جنھوں نے کبھی اپنے عالم ہونے کا نہ تو دعویٰ کیا اور نہ ہی نام و نمود کو پسند کیا۔ زبان و ادب کی خدمت کرنا ہی ان کا مقصدِ حیات تھا۔ مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ آج کے اساتذۂ کرام کس حد تک اپنی ذمہ داریوں کو نبھا رہے ہیں۔ لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ قدیم اساتذہ کی بات اُن کے ساتھ ہی ختم ہو گئی۔

حیدر آباد کی علمی و ادبی تعلیمی و فلاحی تذکروں میں پروفیسر صاحب کا نام معقول لوگوں کے ذہن پر ثبت ہے اب بھی کچھ ایسے طلباء موجود ہیں جو پروفیسر صاحب کے احسان مند ہیں، قدرداں ہیں اور ان کے مسلک کے پیرو بھی ہیں ــــ ادارۂ میرا شہر میرے لوگ نے اس روایت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اوراقِ ماضی کے زیرِ عنوان پروفیسر صاحب کی علمی و ادبی خدمات کو خراج پیش کرنے کے لئے مولانا ابوالکلام آزاد ریسرچ انسٹیٹوٹ میں ادبی اجلاس کا اہتمام کیا تھا۔

پروفیسر سید محمد صاحب جیسے اساتذہ کا جہاں کہیں بھی ذکر ہوتا ہو گا وہاں کا ماحول عطر بیز فضاؤں سے مہکتا ہو گا۔

رائے جانکی پرشاد

گنگا جمنی تہذیب کی منہ بولتی تصویر، وضع دار شخصیت

معاشرہ میں بعض دفعہ ایسے شریف النفس لوگوں سے بھی ملاقات ہو جاتی ہے کہ جن کی شکل و صورت سے ہی پتہ چلتا ہے کہ یہ لوگ شرافت کی آخری حدیں پار کر چکے ہیں۔ اس طرح کے لوگوں کا اندازِ گفتگو، طرزِ تکلم، مخاطب کرنے کا طریقہ کچھ اس طرح متاثر کن رہتا ہے کہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ ایسی برگزیدہ شخصیتیں ہیں جن کی قربت کا ایک ایک لمحہ دل و نظر کو روشنی عطا کر رہا ہو۔ اُن کی نرم گفتاری، اُن کی انسانیت، شرافت، رواداری، دیانت داری اور انسانی رشتوں سے ان کی وابستگی اپنی آپ مثال ہے۔ ایسے شریف النفس لوگوں میں رائے جانکی پرشاد کا نام بھی پہلی صف میں دکھائی دیتا ہے رائے جانکی پرشاد صاحب سے میں اردو مجلس کی معرفت متعارف ہوا تھا لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ میں اُن کے بارے میں کچھ جانتا نہیں تھا۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

کے رفقائے کار ہیں جو ادارۂ ادبیاتِ اردو کے قیام میں اہم حصہ لیتے رہے ہیں ان میں رائے جانکی پرشاد کو بھی باکمال اربابِ فکر و دانش بھول نہیں سکتے۔ ڈاکٹر زور نے ادارۂ ادبیاتِ اردو کے قیام اور اس کی سرگرمیوں کے سلسلے میں اپنے دور کے تمام مشاہیر اور عاشقانِ اردو زبان و تہذیب کا تعاون حاصل کیا تھا۔ رائے جانکی پرشاد نے بھی اپنے ہم عصر قلمکار ادیبوں کی طرح کچھ اہم کتابیں تصنیف و تالیف کی ہیں۔ رائے جانکی پرشاد کو ترجمہ نگاری کے فن سے بڑی دلچسپی تھی اردو میں بعض دیگر زبانوں کے اہم مضامین کو منتقل کیا تھا دارالترجمہ (جامعہ عثمانیہ) کے تمام نشیب و فراز سے واقف تھے چنانچہ انہوں نے مجلۂ عثمانیہ کے جامعہ عثمانیہ نمبر کے لئے دارالترجمہ پر ایک مفصل و ایک جامع اور ایک طویل مضمون مجلۂ عثمانیہ کے لئے ایڈیٹر مجلہ جامعہ عثمانیہ نے تحریر کیا جس کو اہتمام کے ساتھ شائع کیا گیا۔ رائے جانکی پرشاد صاحب کو میں نے ادبی جلسوں اور تہذیبی تقاریب میں ہمیشہ شیروانی ٹوپی پہنے ہوئے دیکھا ہے۔ رائے جانکی پرشاد کا نستعلیق گھرانے میں اعلیٰ حیثیت کے حامل رہے ہیں محکمۂ اطلاعاتِ عامہ میں ناظم کی حیثیت سے مامور تھے۔ کہا جاتا ہے کہ پولیس ایکشن کے بعد جب حیدرآباد میں ملٹری گورنمنٹ قائم ہوئی اور جے این چودھری ملٹری اڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے ریاست کے تمام امور کے ذمہ دار قرار دیئے گئے تھے انہوں نے ریاست کے مختلف محکموں کا جائزہ لیا۔ رائے جانکی پرشاد سے جب انہوں نے ملاقات

کی تو انھیں یقین ہی نہیں آیا تھا کہ رائے جانکی پرشاد ہندو ہیں مسٹر چودھری نے نام پوچھا تو انہوں نے جانکی پرشاد بتایا۔ جے این چودھری حیرت میں پڑ گئے۔ ویسے بھی حیدرآباد کے کائستھ گھرانے مسلم معاشرہ کے بہت قریب رہے ہیں (اب بھی ہیں) ان کی گفتگو ان کا طرز رہن سہن، ان کی پوشاک مسلمانوں کی تہذیب سے میل کھاتی ہے تمام کائستھ لوگ اُردو زبان میں گفتگو کرتے ہیں۔ ۵۰، ۵۵ سال پہلے کائستھ گھرانے کے لوگ شیروانی زیب تن کرتے تھے لیکن اب یہ رواج کم ہو گیا ہے بعض ایسے بھی کائستھ گھرانے رہے ہیں جنھوں نے رومی ٹوپی پہنی ہے رائے جانکی پرشاد بڑے ہی خوش نصیب انسان ہیں کہ ان کی اولاد زیور تعلیم سے آراستہ ہے ان کے بیٹے ڈاکٹر رام پرشاد ان کے دوسرے بیٹے ہیں بڑے بیٹے موہن پرشاد ماہر آثار قدیمہ ہیں ڈاکٹر رام پرشاد [illegible] قدر ادب نواز اور فنکاروں کے قدردان ہیں کہ ان کے علاج کے لئے فیس نہیں لیتے بلکہ اپنے پاس سے دوائیاں بھی دیتے ہیں۔ ڈاکٹر موہن پرشاد اُردو زبان اور شعر و ادب سے کافی دلچسپی رکھتے ہیں۔ سیا[illegible] ہیں ان کے مضامین خاص طور آثار قدیمہ کے موضوعات پر شائع ہوتے رہتے ہیں اشا[illegible] کا یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے ادارۂ ادبیات اُردو کی سرگرمیوں سے وابستہ ہیں۔ یوم محمد قلی قطب شاہ تقاریب کے سلسلے میں اہم معاون کی [illegible] سے انتظامیہ کا ساتھ دیتے ہیں خاص طور پر یوم محمد قلی قطب شاہ

کی افتتاحیہ تقریب میں جو احاطہ گنبد محمد قلی قطب شاہ میں منعقد ہوتی ہے انتظامات میں ہاتھ بٹاتے ہیں رائے جانکی پرشاد کے تمام بیٹے خالص حیدرآبادی تہذیب کے نمائندے ہیں انہوں نے اپنے والدِ محترم کی روایت کو باقی رکھا ہے۔ جانکی پرشاد صاحب کی سرپرستی میں مجھے اردو مجلس کا کام کرنے کا موقع ملا۔ رائے جانکی پرشاد اردو مجلس کے صدر تھے اور میں معتمد تھا جس زمانے میں منظور احمد معتمد اردو مجلس تھے اردو ھال میں اردو مجلس کے زیرِ اہتمام بہت ہی معیاری ادبی مجالس اور تہذیبی تقاریب ہوا کرتی تھیں میں اردو کالج کے طالب علم کی حیثیت سے جہاں منظور احمد میرے استاد تھے اردو مجلس سے دلچسپی رکھتا تھا منظور احمد صاحب کی خواہش پر وقتاً فوقتاً اردو مجلس کے جلسوں میں اُن سے تعاون کرتا تھا ایک دفعہ اردو مجلس کا ایک اہم اجلاس جاری تھا میں جس وقت کسی کام کے سلسلہ میں ہال کے باہر آیا تھا تو رائے جانکی پرشاد ھال کے سامنے ٹہل رہے تھے۔ اس دوران مجھ سے فرمایا بلکہ اپنی عادت کے مطابق نہایت انکساری کے ساتھ کہا کہ آپ اردو مجلس کی سرگرمیوں میں منظور صاحب کا ساتھ دیتے رہیئے۔ انہوں نے یہ بات اردو مجلس سے میری دلچسپی سے متاثر ہو کر کہی تھی جب وہ اردو مجلس کے صدر تھے اور میں معتمد اردو مجلس تھا تو ان سے اکثر دفعہ ملاقات کا موقع ملتا تھا بعض دفعہ اُن کے دولت خانہ واقع ملے پلی نزد تاج محل ہاکیز جانے کا اتفاق ہوا کرتا تھا نہایت ہی سلجھے ہوئے انداز میں تبادلۂ خیال کرتے تھے۔

جانکی پرشاد صاحب انجمن ترقی اردو اور اردو مجلس کے جلسوں میں
لازماً شرکت کرتے تھے ہمیشہ وقت مقررہ پر آتے تھے اور ان کی
نشست ... رہا میں کی پہلی صف میں ہوتی تھی۔ بعض حضرات کا یہ کہنا
ہے کہ اس دور کے تمام مشاہیر زبان و ادب اپنی اپنی نشستوں پر
اس طرح بیٹھتے تھے کہ جیسے وہ جگہ ان کے لئے مختص ہے بعض حضرات کہتے تھے
کہ اردو مجلس ریٹائرڈ اعلیٰ عہدہ داروں اور معمر ادب دوست حضرات
کی انجمن ہے چونکہ اردو مجلس کے جلسوں میں کئی موظف اعلیٰ آفیسرز اور
ادب دوست حضرات شرکت کرتے تھے ان کی شرکت نوجوان شاعروں کے
لئے حوصلہ افزائی کا باعث بنتی تھی اور یہاں ان لوگوں سے کچھ نہ کچھ سیکھا
رہتا تھا۔ مولوی حبیب الرحمٰن، پروفیسر ہارون خان شروانی، رائے
جانکی پرشاد اور اردو کی اہم شخصیتیں موجود رہتی تھیں۔ رائے جانکی
پرشاد کی ساری زندگی اردو ماحول میں گذری۔ اردو تہذیب کے تحفظ و
بقا کی سرگرمیوں سے وابستگی میں بسر ہوئی۔ رائے جانکی پرشاد نے اپنے
آپ کو نہیں بدلا وہ اپنی شریفانہ روش پر آخری دم تک قائم رہے۔
پولیس ایکشن کے بعد کچھ لوگ ضرور بدل گئے لیکن رائے جانکی پرشاد،
ایل این گپتا، جسٹس گوپال راؤ اکبوٹے اور اس طرح کے کچھ اور غیر مسلم
حضرات نے کبھی اپنے آپ کو نہیں بدلا بلکہ انہوں نے پولیس ایکشن کے
زمانے میں پریشان حال مسلمانوں کا بھرپور ساتھ دیا۔ رائے جانکی پرشاد
کی طرح ایل این گپتا بھی اردو زبان اور اس کی بقاء کے لئے سرگرم عمل رہے

حکومت آندھرا پردیش میں فینانس سکریٹری تھے ایل، این گپتا ادبی ٹرسٹ کے صدر نشین بھی رہ چکے ہیں اس کے علاوہ اردو کے کئی اہم اداروں جیسے ادارۂ ادبیات اردو، انجمن ترقی اردو اور مولانا ابوالکلام آزاد انسٹیٹیوٹ وغیرہ سے ان کی کسی نہ کسی حیثیت سے وابستگی رہی۔ رائے جانکی پرشاد کا سلوک اپنے محکمہ کے اسٹاف کے ساتھ ہمیشہ سرپرستانہ و مشفقانہ رہا۔ انھوں نے ہمیشہ ملازمین کی بھلائی اور ان کے فائدے کے بارے میں سوچا اور ان کی بہتری کے لئے بہتر سلوک کا مظاہرہ کیا۔ رائے جانکی پرشاد بھی حیدرآباد کی گنگا جمنی تہذیب کی پاسداری کرنے والی شخصیت رہے ہیں جنھیں مہذب معاشرہ کبھی بھول نہیں سکتا۔ جہاں کہیں اعلیٰ سطح پر اردو زبان و ادب کی بات نکلتی ہے وہاں جانکی پرشاد جیسے محسنین اردو کا تذکرہ ضرور آجاتا ہے ان کے انتقال کے کئی برس بعد بھی انھیں یاد کیا جا رہا ہے ۸ سال پہلے کی بات ہے کہ میں نے ڈاکٹر رام پرشاد کو یہ مشورہ دیا تھا کہ اپنے والد محترم کے نام سے ایک ادبی انجمن قائم کریں تاکہ ان کی یاد میں مختلف اوقات میں ادبی جلسے منعقد کیئے جاتے رہیں جلسوں کے حوالے سے رائے صاحب کی علمی و ادبی خدمات اور ان کے کارناموں اور ان کی شخصیت کے بارے میں تذکرہ ہوتا رہے گا اور اردو کی نئی نسل بھی واقف ہو جائے گی کہ ہمارے شہر میں کیسی کیسی ممتاز شخصیتیں رہی ہیں رائے جانکی پرشاد کی یاد میں ادارۂ میرا شہر میرے لوگ کی جانب سے مولانا ابوالکلام آزاد انسٹیٹیوٹ میں اعلیٰ پیمانے پر ادبی تقریب منعقد

ہوئی تھی جلسہ گاہ اپنی تنگ دامنی کی شکایت کر رہا تھا۔

ایک دفعہ میں اردو مجلس کے ایک پروگرام کو قطعیت دینے کے لئے ان کے گھر ایسے وقت گیا تھا جبکہ ان دنوں وہ اپنی آنکھوں کے آپریشن کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب کی ہدایت کے مطابق گھر پر آرام کر رہے تھے میری آمد کی اطلاع پاکر انہوں نے اپنے مخصوص کمرہ میں آنے کے لئے کہا۔ اُس وقت ڈاکٹر رام پرشاد گھر پر موجود تھے ڈاکٹر رام پرشاد کے ساتھ جانکی پرشاد صاحب رہتے تھے، مجھے بلا لیا۔ چائے بسکٹ سے تواضع کی زبان و ادب کے سلسلے میں گفتگو رہی پھر اردو مجلس کے آئندہ ہونے والے پروگرام کو قطعیت دی گئی۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ وہ ملاقات کو ٹال بھی سکتے تھے لیکن انہوں نے اپنی خاندانی اعلیٰ روایات اور شخصی شرافت کا ثبوت دیتے ہوئے ملاقات میں تامل نہیں کیا۔ وضع داری جانکی پرشاد کی شخصیت کا ایک اہم پہلو تھی۔ اپنے ساتھیوں سے ہمیشہ نرم لہجہ میں گفتگو کرتے تھے ایک صاحب الرائے شخصیت کی حیثیت سے اردو کے مسائل کے بارے میں ان کی رائے کو اہمیت حاصل تھی۔ وہ کئی برس اردو مجلس کے صدر رہے۔ منظور احمد صاحب کے دور میں اردو مجلس کی سرگرمیوں کو تیز تر کر دیا گیا تھا۔ ان کے دور میں رائے جانکی پرشاد کی سرپرستی میں نہ صرف نامور شخصیتوں کی یاد میں اہم جلسے ہوئے بلکہ اردو مجلس کے ترجمان "مجلس" کے خصوصی نمبر جیسے فراق نمبر، مومن نمبر، مولوی عبدالحق نمبر شائع کئے گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت مشکلات کے باوجود بھی اردو تہذیب کے لئے حالات سازگار تھے لیکن آج سب کچھ بدل گیا لوگ زبان و ادب سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ اللہ خیر کرے۔

عابد علی خاں

چشمۂ فیضِ رواں ۔ سوغاتِ دیدہ و دل عظیم صحافی

شہر شرافت نواز، حیدرآباد فرخندہ بنیاد کی عظمت و رفعت کو چار چاند لگانے والے فرزندانِ جامعہ عثمانیہ اور مہذب معاشرہ سے وابستہ ایسی بلند مرتبت و ذی قدر، اعلیٰ ظرف شخصیتیں جن کے کارنامے ناقابلِ فراموش ہیں جو علمی و ادبی، صحافتی و تہذیبی، فلاحی و معاشرتی تاریخ میں سنہرے حروف میں لکھے جائیں گے۔ اُن میں عابد علی خاں صاحب کا نام بھی سرفہرست رہے گا۔ اس سرزمینِ محبت شناس نے ہر دور میں بے شمار صاحبانِ علم و دانش، دانشورانِ فکر و نظر، پاسبانِ تہذیب و ثقافت اور باکمال لوگوں کو جنم دیا ہے۔ پُر وقار و معتبر شخصیت، ممتاز عثمانین و نامور صحافی جناب عابد علی خان صاحب بھی اُن معدودے چند دیدہ وروں میں سے ایک تھے جنھوں نے حیدرآباد کی تہذیبی و علمی زندگی کو نور و نکہت سے معمور کیا۔ عابد علی خاں صاحب جیسی باصلاحیت و قابلِ قدر و منزلت شخصیتیں برسوں میں پیدا ہوتی ہیں ایسی شخصیتیں جو نرم و گرم حالات سے دوچار

رہتی ہیں وہ اپنے پورے وجود کے ساتھ اپنے ہونے کا احساس دلاتی رہی ہیں تعلیمی شعبہ ہو کہ صحافتی و فلاحی شعبہ، تہذیبی ہو کہ ثقافتی کونسا ایسا گوشہ ہے جس میں عابد علی خاں صاحب نے اپنے نقوش نہیں چھوڑے بانیٔ روزنامہ سیاست" جناب عابد علی خاں صاحب اعلیٰ خاندان کے صاحب ثروت، چشم و چراغ ہونے کے باوجود ایک عام آدمی کی طرح معاشرہ کا ایک اہم حصہ بنتے رہے۔ وہ لوگ بہت ہی خوش نصیب ہیں جو عابد علی خاں صاحب کے مخصوص دوستوں میں شامل رہے ہیں۔ وہ لوگ بھی اپنے آپ کو قسمت والے سمجھتے ہیں جو عابد علی خاں صاحب کے حلقۂ احباب اور ان کے خاص دوستوں میں نہیں بلکہ ان کے عقیدت مندوں میں شامل ہیں۔ ان لوگوں کا دامن بھی سرسبز و شاداب ہے جنھیں عابد علی خاں صاحب کی سرپرستی میں اپنی فکر و دانش کے چراغ روشن کرنے کا موقع ملا۔ عابد علی خاں صاحب کی پُرکشش شخصیت کا دائرہ بہت وسیع تھا ان کی فکر و خیال کے عام گوشے روشن و منور تھے جو ہر لمحہ اُجالوں کی تفسیر رہا کرتے تھے خوش مزاجی اور رواداری، مروت، انسان دوستی، تہذیب گذشتہ سے دلبستگی اور دورِ حاضر کے مسائل سے باخبری ان کی طبیعت کا خاصہ تھا۔ عابد علی خاں صاحب نے حیدرآباد کی گنگا جمنی تہذیب اور اپنے بزرگوں کی اعلیٰ و ارفع روایات کے تحفظ و بقا کے لئے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ وقف کیا تھا۔ صحافتی زندگی سے گہری دلچسپی رکھتے ہوئے بھی علم و ادب کے چراغ جلانے اور جلتے ہوئے چراغوں کو آندھیوں سے

بچانے کے لئے نمایاں رول ادا کیا۔

عابد علی خان صاحب نے مدیر سیاست کی حیثیت سے ساری صحافتی دنیا میں اپنا نام روشن کیا۔ سیاست اخبار کی اشاعت ایک ایسے زمانے میں عمل میں آئی جبکہ حیدرآباد کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو سقوطِ ریاست حیدرآباد اور پولیس ایکشن کے مضر اثرات نے انتہائی مشکلوں اور پریشانیوں کے عالم میں مبتلا کر دیا تھا۔

عابد علی خان صاحب زوالِ حیدرآباد کے بعد اپنی زبان اور اپنی تہذیب کے تحفظ و بقاء کے لئے فکرمند تھے ایسے ناگفتہ بہ اور پریشان کن حالات میں کچھ ایسے غیر مسلم لوگ بھی موجود تھے جنھوں نے مسلمانوں کی اپنی جان پر کھیل کر حفاظت کی مسلمانوں کے دل و دماغ پر چھائی احساسِ کمتری کو دور کرنے اور شہرِ حیدرآباد پر جو مختلف قسم کے سیاسی و غیر سیاسی ضرر رساں بادل چھائے ہوئے تھے ان سے نجات دلوانے کے مدعا لئے عابد علی خان صاحب نے اپنے جگری دوست جناب محبوب حسین جگر کے ساتھ سے ۱۵ اگست ۱۹۴۹ء میں اخبارِ سیاست شائع کیا۔ سیاست اخبار کو خاص طور پر حیدرآباد کے مسلمانوں کے مسائل کی یکسوئی اور ملک کے حالات پر پُر اثر تحریروں کے لئے بھی وقف کر دیا تھا۔ سیاست کی اشاعت نے حیدرآباد اور حیدرآبادی مسلمانوں کی غیر معمولی خدمت انجام دی۔ آج اخبارِ سیاست اردو صحافتی دنیا میں بقعہ نور کوہ نور کی طرح جگمگا رہا ہے۔ عابد علی خان صاحب نے اپنی زندگی کے آخری

لمحوں تک سیاست کی ترقی کے لئے ' اُردو زبان کے تحفظ و بقاء اور حیدر آبادی تہذیب و ثقافت کے لئے بہت کچھ کیا۔ جناب عابد علی خان صاحب نے انجمن ترقی اُردو کے شریکِ معتمد کی حیثیت سے بھی ریاستی تعلیمی اُمور کے سلسلے میں بہترین خدمات انجام دیں۔ حیدر آباد کے بعض علمی و تہذیبی اداروں سے ان کی وابستگی نے اُن اداروں اور انجمنوں کا نقشہ ہی بدل دیا۔ اور اُن تمام اداروں کو ترقی دی جن سے وہ وابستہ رہے۔ عابد علی خان صاحب مینجنگ ٹرسٹی ادبی ٹرسٹ تھے جنھوں نے مشاعروں کی آمدنی کے ذریعہ علمی و ادبی اداروں کی کافی مدد کی۔ بعض تعلیمی' علمی و ادبی اداروں کے لئے ٹرسٹ بنوائے اور اچھی خاصی رقم فکسڈ ڈپازٹ کے طور پر محفوظ کروائی۔ ادارۂ ادبیاتِ اُردو ' اُردو گھر اور کچھ اور علمی و ادبی ادارے جس کی روشن مثال ہیں۔ ۱۹۶۶ء میں ادبی ٹرسٹ کا قیام عمل میں لایا گیا۔ ادبی ٹرسٹ کے مشاعروں میں ہندوستان و پاکستان کے اہم شاعروں کو مدعو کیا جاتا رہا۔ انھوں نے شنکر جی میموریل سوسائٹی کی بنیاد رکھی۔ شنکر جی کے نام پر کل ہند مشاعروں کا آغاز کیا۔ عابد علی خان صاحب کی خدمات کی ایک طویل فہرست ہے عابد علی خان کی صحافتی خدمات کے اعتراف میں کئی صفحات... لکھے جاسکتے ہیں۔ میرے اس تاثراتی مضمون میں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ ان کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر بھرپور روشنی ڈالی جاسکے اس مختصر و نامکمل تحریر کے ذریعہ صرف ایسے واقعات کا بھی ذکر کرنا چاہتا ہوں

جو میری ادبی و ثقافتی زندگی کے نشو و نما میں کلیدی رول ادا کرتے رہے ہیں جب میں ۱۹۵۹ء میں سیاست سے وابستہ ہوا تو اُس وقت میں عابد علی خاں صاحب سے واقف ضرور تھا لیکن "سیاست" سے وابستگی کے بعد ان کی شخصیت کے منفرد گوشے میری نظروں میں تازہ اُجالوں کی طرح عیاں ہونے لگے۔ میں نے اپنے بعض مضامین میں بتایا ہے کہ کس طرح سیاست سے میری وابستگی ہوئی۔ میں اُن باتوں کو دوہرانا چاہتا ہوں تاکہ سیاست سے میری وابستگی کی ۴۲ برسوں کی سرگرمیاں مختصر سہی قارئین کے علم میں رہیں۔ ۱۹۵۹ء میں، میں اورینٹل اردو کالج میں بی۔ او۔ ایل کا طالب علم تھا۔ کالج کی بزم اُردو کا صدر بھی تھا کالج کی شعری و ادبی محفلوں کی خبریں سیاست میں اشاعت کے لئے لایا کرتا تھا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب سیاست کا آفس ٹین شیڈ میں "سیاست" کی پرانی عمارت کے روبرو ایک چھوٹی سی جگہ پر قائم تھا سیاست میں اشاعت کے لئے جگر صاحب کو نیوز دیا کرتا تھا۔ ایک دن عابد علی خاں صاحب پر میری نظر پڑی۔ اُس وقت آفس میں عابد علی خاں صاحب، جگر صاحب اور شاہد صدیقی صاحب موجود تھے۔ ۱۹۵۹ء میں جگر صاحب نے محفلِ شعر کالم کا کام میرے تفویض کیا۔ محفلِ شعر کے کالم کی وساطت سے میں سیاست کی آئندہ ہونے والی بہت سی ادبی سرگرمیوں سے وابستہ ہوتا چلا گیا۔ سیاست کی مختلف نوعیت کی ادبی سرگرمیوں کے سلسلے میں جگر صاحب کی زیرِ نگرانی کام کرتا رہا۔ عابد علی خاں صاحب موجود

رہیں تو انھیں سلام کر لیا کرتا تھا۔ ادبی ٹرسٹ کے قیام کے بعد عابد علی خان صاحب سے میری قربت بڑھنے لگی۔ عابد علی خان صاحب نے ادبی ٹرسٹ کی سرگرمیوں میں مجھے شامل کر لیا۔ ادبی ٹرسٹ کی سرگرمیوں کے سلسلے میں عابد علی خان صاحب سے ربط رکھنا ضروری ہوتا تھا ان دنوں ادبی ٹرسٹ کی سرگرمیاں بڑھتی جارہی تھیں جب ادبی ٹرسٹ کا قیام عمل میں آیا تو ایک دن عابد علی خان صاحب نے ادبی ٹرسٹ کا کام مجھے سونپتے ہوئے فرمایا تھا کہ ادبی ٹرسٹ حیدرآباد کے شاعروں اور ادیبوں کے لئے قائم کیا گیا ہے میں چاہتا ہوں کہ آپ آفس کی ذمہ داری سنبھالیں اور یہ بھی فرمایا تھا کہ آپ کو اعزازی طور پر کام کرنا ہوگا۔ میں نے بلا تامل ہاں کہہ دیا اور کہا کہ بلا معاوضہ کام کروں گا۔ میں نے یہ بھی کہا تھا کہ جب تک آپ کا مجھ پر اعتماد رہے گا میں کام کرتا رہوں گا۔ ادبی ٹرسٹ کے قیام کے ایک ماہ بعد آفس کا کام میرے سپرد کیا گیا۔ ادبی ٹرسٹ کے دفتری امور میرے ذمے تھے اکاونٹس اور بعض دیگر کام "سیاست" آفس کے اسٹاف سے لیا جاتا تھا۔ جیسے جیسے میں عابد علی خان صاحب کے قریب ہوتے گیا وہ مجھ پر کچھ زیادہ ہی مہربان ہونے لگے۔ مجھ سے بے حد پُر خلوص، سرپرستانہ سلوک جاری رکھا۔ ادبی ٹرسٹ کا کام "سیاست" کے تفویض کردہ کام کے ساتھ جاری رہتا تھا۔ ادبی ٹرسٹ کے مشاعروں کا جب ۱۹۶۶ء میں آغاز ہوا تو مشاعروں سے متعلق تمام امور سے واقف کرواتے تھے مشاعروں سے متعلق اطلاعات میری تحویل میں رہتے تھے۔ ان دنوں میں

سکریٹریٹ میں یو۔ ڈی۔ سی (اسسٹنٹ سکشن آفیسر) تھا سکریٹریٹ جانے سے پہلے صبح ۱/۲ ۹ بجے سیاست آفس پہونچتا تھا اور شام میں ۱/۲ ۵ بجے سے "سیاست" میں رہتا۔ تعطیلات کے دنوں میں سوائے اتوار کے ہر روز صبح ۱۰ بجے سے ۶ بجے شام تک سیاست میں موجود رہتا۔ ادبی ٹرسٹ کے زیر انتظام ایک بک اسٹال قائم کیا گیا تھا جس کا میں انچارج تھا ایک اسٹال کتار ابنک عابد روڈ کے شوروم میں قائم تھا۔ سکریٹریٹ سے لوٹتے ہوئے بک اسٹال کی کارکردگی کا جائزہ لیتا تھا "سیاست" پہنچنے کے بعد ادبی ٹرسٹ کے کام کے علاوہ مجھ سے متعلق سیاسی و ادبی کاموں کے سلسلے میں مصروف رہتا۔ عابد علی خان صاحب مجھ پر غیر معمولی اعتبار کرتے تھے چنانچہ انہوں نے ادبی و سیاسی مخفی امور سے متعلق ایک خاص فائل میرے حوالے کی تھی۔ اسی طرح جناب محبوب حسین جگر نے بھی ایک خاص فائل میرے حوالے کی تھی۔ تمام اہم خطوط و کاغذات جو ادبی و سیاسی نوعیت کے ہوتے تھے میری تحویل میں رہتے۔ عابد علی خان صاحب جب ادبی جلسوں میں جاتے تو اکثر دفعہ مجھے اپنے ساتھ رکھتے۔ عابد علی خان صاحب کے استعمال میں سیاہ رنگ کی ایمبیسیڈر کار تھی جس کا نمبر ۷۸۶ تھا نمبر پلیٹ اردو میں تھی۔ عابد علی خان صاحب انجمن ترقی اردو کی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کرتے تھے۔ انجمن کی کارروائیاں چاہے ریاستی حکومت سے تعلق رکھتی ہوں کہ مرکزی حکومت سے آسانی کے ساتھ پایہ تکمیل کو پہنچ جاتیں۔ عابد علی خان صاحب بہت ہی دوست نواز

انسان تھے۔ ہر حکومت کے سربراہ اُن سے مراسم رکھتے تھے "سیاست" کی مستند حیثیت نے بڑے بڑے سیاسی وغیر سیاسی قائدین و رہنماؤں کو عابد علی خان صاحب سے قریب کیا تھا سیاست آج بھی ہندوستان کے تمام اُردو اخبارات میں اپنی انفرادیت اور خصوصی پہچان کے ساتھ غیر معمولی شہرت کا حامل ہے جناب عابد علی خان صاحب نے اپنے دوست اور رفیق کار جناب محبوب حسین جگر کی رفاقت و مشاورت سے سیاست کی شہرت کو آسمان کی بلندیوں تک پہونچا دیا۔ عابد علی خان صاحب اور محبوب حسین جگر کی دوستی مثالی تھی۔ جگر صاحب نے اپنی ساری زندگی "سیاست" کے لئے وقف کر دی تھی "سیاست" اخبار کا ہر کام ایک دوسرے کے مشورہ سے انجام پاتا تھا دونوں ایک جان دو قالب تھے عابد علی خان صاحب نے صحافتی خدمات کے علاوہ ادبی خدمات کے لئے بھی نمایاں حصہ ادا کیا۔

ادبی ٹرسٹ کے مینجنگ ٹرسٹی کی حیثیت سے قیام ادبی ٹرسٹ سے اپنی رحلت تک اس عہدہ پر فائز رہے۔ ادبی ٹرسٹ کے مشاعرے ساری دنیا میں مشہور رہیں۔ ہندوستان میں اتنا بڑا مشاعرہ کہیں بھی نہیں ہوتا۔ ملک کے تمام اہم اور صف اول کے شاعروں نے ادبی ٹرسٹ کے مشاعروں میں شرکت کی ہے۔ پاکستان کے بعض اہم شاعروں نے بھی حصہ لیا۔ عابد علی خان صاحب ایک خوشحال گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ اعلیٰ درجہ کا خاندانی پس منظر ہے ۔۔۔ جامعہ عثمانیہ میں اعلیٰ تعلیم کے لئے داخلہ لیا۔ جامعہ عثمانیہ سے گرائجویشن کیا جامعہ عثمانیہ میں انھیں مختلف الطبع

اساتذہ اور طلباء سے سابقہ پڑا۔ جس کی وجہ سے ان کی صلاحیتوں کو ابھرنے کا موقعہ ملا۔ ان کی بہترین کارناموں کی وجہ سے ان کا نام ممتاز عثمانین میں بھی سنہری حرفوں سے لکھا جائے گا عابد علی خان صاحب شہر کی بعض قابلِ ذکر اور اہم ادبی، فلاحی، تعلیمی و ثقافتی اداروں اور انجمنوں سے وابستہ رہے۔ انجمن ترقی اردو کے معتمد اور نائب صدر کی حیثیت سے نمایاں خدمات انجام دیں۔ عابد علی خان صاحب کے مراسم ہر حکومت سے خوشگوار رہے۔ اخبار سیاست کو کبھی بھی کسی سیاسی پارٹی کا ترجمان نہیں بنایا۔ سیاست اپنی غیر جانبدارانہ پالیسی کی وجہ سے بھی روز افزوں ترقی کے زینے طے کرتا گیا۔ "سیاست" کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ سیاست میں شائع ہونے والی ہر تحریر کو سند کا درجہ حاصل رہتا ہے سیاست کے اداریئے اپنی آپ مثال ہوتے ہیں عابد علی خان صاحب کو حکومت کے سربراہوں نے حکومت میں ایک اہم سیاسی پوزیشن سے نوازنے کی کوشش کی لیکن انہوں نے کسی بھی سیاسی پارٹی میں اپنی شرکت مناسب نہیں سمجھی۔ تقریباً ہر حکومت نے انہیں رکن پارلیمنٹ کی پیشکش کی۔ لیکن انہوں نے انکار کیا۔ عابد علی خان صاحب مجھے بہت عزیز رکھتے تھے میرے کام کی قدر کرتے تھے میری سرپرستی بلکہ ہمیشہ فراخ دلی سے کام لیا کرتے تھے سیاست کی اتنی طویل رفاقت کے دوران کبھی بھی کسی بھی سلسلے میں ناراضگی یا خفگی کی صورتحال پیدا نہیں ہوئی مجھ سے ہمیشہ مسکراتے ہوئے بات کرتے تھے جب سیاست آفس

یا ہر کے بڑے شاعر و ادیب آتے تو میرا بھرپور تعارف کروا تے۔ مجھے محبت سے نیر کی بجائے نائر کہہ کر مخاطب کرتے اور کبھی شاعرِ اعظم کہتے تھے۔ مجھ پر بے حد اعتماد رکھتے تھے عابد علی خان صاحب نے تا دم حیات اپنی مسکراہٹ میں کبھی کمی آنے نہیں دی۔ ادبی ٹرسٹ کے اشتہارات کا بہ غور مطالعہ فرماتے اور مناسب تجاویز سے سرفراز فرماتے تھے۔ میں اخبار سے متعلق کام جگر صاحب کی راست نگرانی میں انجام دیا کرتا تھا عابد علی خان صاحب بھی باخبر رہتے تھے۔ عابد علی خان صاحب اور جگر صاحب کا لنچ مشترک ہوتا تھا مجھے بھی لنچ میں شریک فرماتے سیاست سے متعلق بعض ادبی معاملات میں مجھ سے مشورہ لیتے اور ادبی محفلوں اور ادبی تقاریب سے مجھ کو وابستہ کرتے تھے عابد علی خان صاحب کی رہائش گاہ میرا اکثر دفعہ محفلیں سجتی تھیں عشائیہ میں لازماً مجھے مدعو فرماتے تھے اپنے خاندان کے ایک فرد کی طرح مجھ سے سلوک فرماتے۔ عابد علی خان صاحب کو ادبی ٹرسٹ کے کاموں سے اس قدر لگاؤ تھا کہ وہ بہ حالتِ بیماری متعلقہ اشتہارات ملاحظہ فرماتے تھے۔ عابد علی خان صاحب کی علالت کے زمانے میں ادبی ٹرسٹ کی مثلیں لے کر میں خود جاتا تھا وہ پلنگ پر لیٹے لیٹے فائیلوں کا مطالعہ فرماتے اور مناسب تجاویز اور ہدایتوں سے سرفراز کرتے۔ عابد علی خان صاحب نے کام کو ہمیشہ اہمیت دی۔ ادبی ٹرسٹ کے مشاعروں کے سلسلے میں بھی مجھ پر یہ ذمہ داری عائد کی گئی تھی کہ میں مشاعرہ کی بیمن فائیل کو UP TO DATE رکھوں۔ مدعو شعراء کو

خطوط لکھنے ہدایت فرماتے۔ میرے مسودہ میں حسب ضرورت ہو تو ترمیم و اضافہ کرتے اور اپنے دستخط کے ساتھ ہماری روانی کو آگے بڑھا دیتے۔ ادبی ٹرسٹ کے مشاعروں کے لئے مہمان و میزبان شعراء کی فہرست کو میری موجودگی میں قطعیت دی جاتی۔ مشاعرہ سے متعلق سرگرمیاں زیادہ تر جگر صاحب کی زیر نگرانی جاری رہتیں۔ ادبی ٹرسٹ کے مشاعرہ کی وساطت سے ملک کے بیسیوں شاعروں کو روشناس کروایا گیا۔ مہمان شعراء کی دل کھول کر تشہیر کی جاتی تھی "سیاست" کے ذریعہ کی جانے والی تشہیر سے بیرونی شعراء نے غیر معمولی مقبولیت حاصل کی۔ ادبی ٹرسٹ کے مشاعرے کسی وقت بھی بدنظمی کا شکار نہیں ہوئے۔ اعلیٰ انتظام کے ساتھ ساتھ عوام کے بھرپور تعاون نے ادبی ٹرسٹ کے مشاعروں کی مقبولیت میں کافی اضافہ کیا ہے۔ عابد علی خان صاحب نے اردو تحریک سے ہمیشہ اپنے آپ کو وابستہ رکھا۔ شخصی طور پر اور اخبار کے ذریعہ اردو کے مسائل کی یکسوئی فرماتے رہے۔ عابد علی خان صاحب کے مراسم نہ صرف تمام حکومتوں کے سربراہوں سے ہی تھے بلکہ ملک بھر کے تمام اہل قلم دانشوران شعر و ادب سے بھی تھے۔ اس مضمون میں کہاں اتنی گنجائش ہے کہ میں عابد علی خان صاحب کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کر سکوں۔ یہ ایک ایسی ہمہ گیر شخصیت گذری ہے کہ جن پر ایک ضخیم کتاب لکھی جا سکتی ہے خاص طور پر ان کی صحافتی خدمات ہر دور میں یاد رکھی جائیں گی۔ صحافتی دنیا میں جگر صاحب کے ذکر کے بغیر عابد علی خان صاحب

کا ذکر نامکمل اور ادھورا سمجھا جائے گا۔ عابد علی خان صاحب کا انتقال ۱۲ نومبر ۱۹۹۲ء ہوا۔ طویل علالت کے زمانے میں بھی اخبار کی مصروفیات سے اپنے آپ کو وابستہ رکھا۔ عابد علی خان صاحب کے انتقال کی خبر جناب محبوب حسین جگر نے روتے ہوئے مجھے ذریعہ فون دی تھی اُس وقت صبح کے ۵ بجے تھے۔ جب میں عابد علی خان صاحب کے گھر پہونچا تو سارا گھر ماتم کدہ بنا ہوا تھا عابد علی خان صاحب کی میت تک پہونچا انہیں دیکھا اور ان کے قدموں کو چھوکر اپنا نذرانہ عقیدت پیش کیا۔ کچھ دیر بعد جگر صاحب نے فرمایا جن جن لوگوں کو اطلاع دینا ہے فون پر دے دو جگر صاحب کے ارشاد کے بعد میں اپنے گھر گیا اور وہاں سے تقریباً ۵۰ حضرات کو فون پر عابد علی خان صاحب کے انتقال کی خبر دی۔ عابد علی خان صاحب کے جنازے میں ہزاروں لوگوں نے بلا تخصیص مذہب و ملت شرکت کی تھی۔ انہیں قبرستان آخرت منزل میں دفن کیا گیا۔

عابد علی خان صاحب کی گورنر آندھرا پردیش کرشن کانت سے گہری دوستی تھی گورنر صاحب جب پہلی دفعہ گورنر حیدرآباد تشریف لائے تو انھوں نے حیدرآبادی مسلمانوں میں سب سے پہلے عابد علی خان صاحب سے ملاقات کی۔ عابد علی خان صاحب کی زندگی تک ان کے دوستانہ مراسم باقی رہے عابد علی خان صاحب کے مشورہ اور تعاون سے راج بھون میں ادبی و تہذیبی سرگرمیاں کا آغاز ہوا۔ عابد علی خان صاحب کی وجہ سے ہی مجھے گورنر صاحب سے قربت حاصل ہوئی۔ راج بھون کی ایک اہم تقریب میں عابد علی خان صاحب

نے گورنر صاحب سے میرا بھرپور تعارف کروایا تھا۔ یہلا تعارف اس قدر پُر اثر تھا کہ گورنر صاحب راج بھون کی ہر تقریب میں مجھے مدعو فرمانے لگے۔ گورنر صاحب نے بعض مواقع پر اردو شعر و ادب کے سلسلے میں مجھ سے تعاون حاصل کیا کرتے تھے عابد علی خان صاحب کے بڑے فرزند جناب زاہد علی خان نظام کالج کے طالب علم تھے نظام کالج سے گرایجویشن کرنے کے بعد ۱۹۶۴ء میں سیاست سے وابستہ ہو گئے۔ عابد علی خان صاحب اور جگر صاحب کی راست تربیت انھیں حاصل رہی۔ زاہد علی خان صاحب اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کی وجہ سے غیر معمولی خدمات انجام دے رہے ہیں عابد علی خان صاحب کے انتقال کے بعد ایڈیٹر "سیاست" بنے۔ زاہد علی خان صاحب نے "سیاست" کی مقبولیت میں کافی اضافہ کیا۔ آج "سیاست" اپنی کامیابی کی آخری منزلیں طے کر رہا ہے اور روشنی کا یہ سفر اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جاری ہے۔ عابد علی خان صاحب کی قیادت میں بھی۔ ہم سال جشن حیدرآباد تقاریب جدہ کے سلسلے میں جدہ جانے کا اعزاز حاصل ہوا اسی طرح۔ ہم سال جشن حیدرآباد تقاریب کویت میں بھی عابد علی خان صاحب کی سرپرستی میں میں نے بھی شرکت کی تھی۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور "سیاست" کی اشاعت پر بہت خوش تھے عابد علی خان صاحب کی صلاحیتوں کے معترف تھے۔ جناب عابد علی خان صاحب انجمن ترقی پسند مصنفین حیدرآباد کے معتمد عمومی بھی رہ چکے ہیں۔ مدرسہ عالیہ میں ان کے ہم جماعت مشہور کرکٹر غلام احمد اور غلام دستگیر قریشی آئی اے ایس بھی تھے۔

سابق چیف منسٹر آندھرا پردیش جناب این ٹی راما راؤ حیدرآباد کے کسی مسلمان کو خاطر میں نہیں لاتے تھے لیکن عابد علی خان صاحب وہ واحد شخصیت تھے جن کی وہ قدر کرتے تھے اضلاع کی ادبی تقاریب میں بھی عابد علی خان صاحب کے ساتھ میں رہا ہوں۔ خاص طور پر محبوب نگر کی اردو کانفرنس اور مشاعروں میں اکثر ان کے ساتھ رہتا تھا۔ کرنول کے سالانہ کل ہند تہنیتی مشاعرہ میں بھی اپنی کار میں مجھے لے گئے تھے۔ عابد علی خان صاحب بہت خوش خط تھے ان کی تحریر بڑی جاذب نظر تھی وضع داری ان کی شخصیت کی نمایاں خصوصیت تھی۔ ہمیشہ شیروانی زیب تن کرتے۔ کبھی کبھی رومی ٹوپی پہنا کرتے۔ جناب عابد علی خان صاحب ایک باصلاحیت مدیر ہی نہیں تھے بلکہ اعلیٰ درجہ کے مدبر اور منتظم بھی تھے۔ صدر نشین مجلس عاملہ اردو اکیڈیمی کی حیثیت سے اردو اکیڈیمی سے ان کی وابستگی نے اکیڈیمی کو ایک کارکرد اور فعال ادارہ بنا دیا تھا۔ انہوں نے اپنی بہترین تنظیمی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اردو اکیڈیمی کی سرگرمیوں کو وسعت دی اور تمام شاعروں اور ادیبوں کے لئے ایک پلیٹ فارم مہیا کیا۔ عابد علی خان صاحب کا نام حیدرآباد کی ادبی و تہذیبی، معاشی و تعلیمی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گا عابد علی خان صاحب مجھ پر ہمیشہ مہربان رہے۔ ان کے احسانات و سرفرازی اور حوصلہ افزائی کی ایک لمبی فہرست ہے خدا انھیں اپنے مخصوص پاکباز بندوں کی طرح اپنی جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ حیدرآباد پر عابد علی خان صاحب کے احسانات ہمیشہ زرافشانی کرتے رہیں گے ▲

محبوب حسین جگر

(میدانِ صحافت کی منفرد شخصیت۔ نیک انسان)

ہر مہذب معاشرہ میں کچھ ایسی دلنواز و دلپذیر دل و نظر میں گھر کرنے والی پُراثر شخصیتیں موجود رہتی ہیں جن کی زندگی کا ایک ایک لمحہ بارانِ فیوض و برکات کی صورت میں تشنگیٔ جسم و جاں کو سیراب کرتا رہتا ہے۔ دیدہ و دل میں اُترنے والی شخصیتوں کی حیاتِ درخشاں زندہ معاشرہ میں کچھ ایسا نور پھیلا دیتی ہیں کہ آس پاس کا سارا ماحول جگمگانے لگتا ہے جن کی خوشبو دامانِ فکر و خیال کے ہر گوشہ میں بسی رہتی ہے اور جن کی پوری زندگی نوازشاتِ بے پایاں کی آئینہ دار ہوتی ہے اس طرح کے فرش نشین لوگ ہی آسمانوں کی بلندیوں سے بھی آگے نکل جاتے ہیں اور وہ کچھ ایسا کام کر جاتے ہیں کہ اُن کا نام اور اُن کا کام ہر دور میں روشن و پُر نور دکھائی دیتا ہے۔ اس طرح کے منتخب لوگوں میں شامل محبوب حسین جگر صاحب کا نام بھی یہی سیاہی سے لکھا ہوا قرطاس و قلم کی آبرو بڑھاتا رہے گا۔

سلطنت صحافت کی منفرد شخصیت جناب محبوب حسین جگر نے صحافت کی دنیا میں ہی نہیں، علمی و ادبی، تہذیبی و معاشرتی، فلاحی و اصلاحی جیسے ہر شعبہ کو اپنی فہم و ادراک اور فکر و خیال کی روشنی سے تابناک کیا ہے اردو صحافت کی دنیا کا کون ایسا شخص ہوگا جو محبوب حسین جگر کے صحافتی کارناموں سے واقف نہیں۔ کس شخص سے کیا کام لینا ہے صرف خدائے قدوس ہی بہتر جانتا ہے۔ ایک ملازم سرکار کی حیثیت سے عملی زندگی میں حصہ لینے کے کچھ عرصہ بعد ان کی زندگی میں ایک ایسا موڑ آیا کہ انہوں نے ملازمت کو خیرباد کہتے ہوئے صحافتی دنیا میں قدم رکھا اور ایک صحافی کی حیثیت سے غیر معمولی شہرت حاصل کی۔ میں نے محبوب حسین جگر صاحب کے انتقال کے بعد سائبان کے نام سے جو کتاب لکھی ہے اس میں جگر صاحب کی صحافتی زندگی کے ایک ایک پل کا اپنے مشاہدات و تجربات کی روشنی میں حوالہ دیا ہے۔ میں نے سیاست سے اپنی وابستگی ۱۹۵۹ء سے لے کر ان کے انتقال تک کے شام و سحر کو اس کتاب میں محفوظ کیا ہے اس کتاب میں وہ سب کچھ ہے جو بہت سے لوگوں کے علم میں نہیں ہے میں نے سائبان میں جگر صاحب کے بارے میں ہی نہیں جناب عابد علی خان صاحب مدیر سیاست کی خدمات کے بارے میں بھی کھل کر لکھا ہے شہر کے تقریباً تمام اہل قلم جو شعر و ادب و صحافت سے دلچسپی رکھتے ہیں واقف ہیں کہ میرا سیاست اخبار سے کس طرح کا والہانہ رشتہ برقرار ہے حیدرآباد کے ادبی و تہذیبی اداروں اور انجمنوں کے سربراہوں اور ارکان کا کسی نہ کسی طرح "سیاست" سے تعلق برقرار رہتا ہے۔ ادبی تہذیبی اور فلاحی، انجمنوں اور

اداروں سے وابستہ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ان کی سرگرمیوں سے عوام اور خاص طور پر شعر و ادب کی دنیا سے وابستہ لوگ سیاست سے واقف ہیں کچھ ایسے ہی حالات تھے کہ میں اپنی اور اپنی ادبی محفل کی بات علمی و ادبی حلقوں تک پہونچانے کے لیے سیاست آفس پہونچا۔ میں ان دنوں اورینٹل اردو کالج کا طالب علم تھا بزم اُردو کا صدر بھی تھا۔ مجھے شعری و ادبی و تہذیبی سرگرمیوں سے بے حد لگاؤ تھا۔ میں چاہتا تھا کہ بزم اُردو اورینٹل کالج کی سرگرمیوں کی زیادہ سے زیادہ تشہیر ہو۔ سیاست اخبار نے میری دل کھول کر پذیرائی کی۔ بزم اُردو کی ہر ایک نیوز سیاست میں اہتمام کے ساتھ شائع ہوا کرتی تھی۔ ایک دن کی بات ہے کہ میں اورینٹل اُردو کالج کی بزم اُردو کے کسی جلسے کی نیوز لے کر سیاست آفس پہونچا۔ اُس وقت جگر صاحب اور عابد علی خان صاحب اپنی اپنی کرسیوں پر تشریف فرما تھے۔ نیوز میں نے جگر صاحب کے حوالے کی۔ جگر صاحب نے بیٹھنے کے لئے فرمایا۔ اچھے موڈ میں تھے۔ جب کسی کی حوصلہ افزائی کرنا چاہتے تو وہ خوشگوار لب و لہجہ میں گفتگو کرتے تھے مجھ سے اُردو کالج اور بزم اُردو کی سرگرمیوں کے بارے میں دریافت فرمایا۔ پتہ نہیں انہیں میری کونسی بات پسند آئی کہ انہوں نے مجھے اخبار سیاست سے وابستہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اُس وقت تک عابد علی خان صاحب سے میری کوئی گفتگو نہیں ہوئی تھی صرف جگر صاحب سے ہی گفتگو ہوتی رہی۔ دوسرے کمرے میں شاہد صدیقی صاحب اپنا کالم شیشہ و تیشہ لکھنے میں مصروف تھے۔ جگر صاحب نے انہیں بلوایا۔ میرا تعارف کروایا اور کہا کہ شاہد

انہیں محفلِ شعر کا کالم دیا۔ ان دنوں محفلِ شعر کی ترتیب شاہد صدیقی صاحب کے ذمہ تھی ہفتہ میں ایک دن نہایت پابندی سے ہر دوشنبہ کو محفلِ شعر کی اشاعت عمل میں آتی تھی میں ہر چہارشنبہ کو سیاست آفس جاتا تھا۔ نئے لکھنے والے شاعروں کا کلام جو ایک خاص لفافے میں محفوظ رہتا تھا لے کر بہترین غزلوں کا انتخاب کرتا تھا۔ اُس زمانے میں (۱۹۵۹ء ۔۶۰) میں میں نے شعر و ادب کی سرگرمیوں سے اپنے آپ کو کافی سرگرمِ عمل رکھا۔ بزمِ اردو کی سرگرمیوں کے علاوہ شہر کے مختلف کالجس میں ہونے والے مشاعروں میں شرکت کرتا تھا۔ ان دنوں تمام کالجس میں بڑے اہتمام کے ساتھ شعری و ادبی محفلیں آراستہ کی جاتی تھیں میں تقریباً ہر کالج کے مشاعرہ میں مدعو رہتا تھا محفلِ شعر کا کالم میرے سیاست سے وابستہ ہونے کا پہلا زینہ تھا پھر جیسے قربت بڑھنے لگی تو جگر صاحب نے مجھے مختلف نوعیت کے ادبی و شعری سرگرمیوں میں مصروف رکھا۔ چنانچہ شعری مقابلے بہترین اشعار کا انتخاب یا دیگر اصنافِ سخن پر مضامین لکھوائے۔ جگر صاحب نے مجھ سے ایک ایسا اہم ادبی کام بھی لیا جس کی بدولت مجھے اردو شاعروں کا مختصر تذکرہ مع انتخابِ کلام ترتیب دینے کا موقع ملا۔ انہوں نے ہر ہفتہ ایک منتخب شاعر کی مختصر حیات اور اُس کے کارناموں پر مجھ سے مضمون لکھوا کر انتخابِ کلام کے ساتھ "سیاست" میں شائع کروایا۔ محمد قلی قطب شاہ سے لے کر رئیس اختر تک ۱۲۴ شاعروں کی حیات اور شاعری پر میر اتعارف مع انتخابِ کلام شائع ہو چکا ہے جس کو کتابی شکل میں منظرِ عام پر

لانے سے ادبیاتِ اُردو کی تاریخ و تذکرہ میں ایک اضافہ ہوگا۔ میں یہاں اس بات کی وضاحت کر دینا چاہتا ہوں کہ اس کے علاوہ "سیاست" سے متعلق جو بھی ادبی محفل ہوتی مجھے لازماً ان میں شامل کیا جاتا بیشتر جلسوں کا مجھے کنونیر مقرر کیا جاتا تھا۔ سب کچھ جگر صاحب کی سرپرستی میں ہوتا تھا جگر صاحب ہی مجھے سیاست کی ادبی سرگرمیوں میں شامل کرتے تھے یقیناً وہ عابد علی خان صاحب سے مشورہ کرتے ہوں گے زیادہ تر مجھے جگر صاحب سے سابقہ پڑتا تھا میں سیاست میں کبھی بھی سب ایڈیٹر نہیں رہا۔ میرے ذمہ صرف شعر و شاعری کا شعبہ تھا لیکن جگر صاحب کبھی کبھی مجھ سے رپورٹر کا کام بھی لیا کرتے تھے اور کبھی کبھی ترجمہ کا کام بھی تفویض کرتے تھے سیاست اخبار کے بارے میں، جو کچھ بتا رہا ہوں وہ سب کچھ اپنی معلومات و مشاہدات کی بنیاد پر ضبطِ تحریر میں لایا ہے۔ سیاست اخبار سے میری اٹوٹ وابستگی شہر کے بعض شاعروں، ادیبوں کے لئے حسد و جلن کا باعث بنی۔ ادارۂ سیاست سے میرا تعلق انھیں ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا وہ چاہتے تھے کہ میرا سیاست سے تعلق باقی نہ رہے۔ بے شمار شکایتیں کی جاتیں جو سب کی سب دروغ گوئی پر مشتمل رہتی تھیں۔ لیکن جگر صاحب ٹس سے مس نہیں ہوتے تھے انھیں یقین کامل تھا کہ میں سیاست کے مفاد کے خلاف کچھ بھی نہیں کرتا۔ انہیں مجھ پر بھرپور اعتماد تھا ایک دفعہ ان حالات کی روشنی میں کچھ شاعروں اور ادیبوں کی موجودگی میں انھوں نے کہا تھا کہ "نیر کو میں نے اتنا تپایا ہے کہ وہ کندن بن گئے ہیں" مجھ سے

سے کفنے بھونکنے والے بھونکتے رہتے ہیں تم اپنا کام کیا کرو اور کہتے تم سے
جلتے ہیں، حسد کرتے ہیں"۔ سیاست سے وابستگی کی وجہ سے اچھے خاصے
لوگ بھی محض جلن اور حسد کی وجہ سے آج تک بدگمان ہیں اور سمجھتے ہیں کہ میں
اُن کے اور اخبار سیاست کے درمیان حائل ہوں حالانکہ یہ بالکل غلط ہے
میں سیاست اخبار سے ہمیشہ دیانتدار رہا اور دیانتدار ہوں۔ یہی وجہ
ہے کہ ۱۹۵۹ء سے آج تک اپنی پُروقار وابستگی پر فخر محسوس کرتا ہوں۔
جگر صاحب میری بے حد قدر کرتے تھے۔ ہمیشہ مجھ سے اپنے چھوٹے بھائی جیسا
سلوک کرتے تھے اور میں نے بھی ہر وقت اپنے پورے خلوص و وفاداری کا
ثبوت دیا۔ سیاست سے وابستہ ہونے کے بعد شہر اور بیرون شہر کے
اہم اہم دانشوروں سے میرے مراسم پیدا ہوئے۔ اس کی ایک اہم وجہ یہ ہے
کہ میں نے اپنے رکھ رکھاؤ اور اپنے وقار کو متاثر ہونے نہیں دیا۔ جگر صاحب
ہوں کہ عابد علی خان صاحب خاص طور پر باہر کے شاعروں، ادیبوں سے میرا
تعارف بہت ہی عمدگی اور میری پوری پہچان کے ساتھ کرواتے تھے جس سے
سامنے والے کو اندازہ ہوتا تھا کہ عابد علی خان صاحب اور جگر صاحب کی نظروں
میں میرا کیا مقام ہے سیاست اخبار کا سارا انتظامیہ جگر صاحب کی
زیر نگرانی کام کرتا رہا۔ عابد علی خان صاحب نے کبھی بھی جگر صاحب کے اختیارات
میں مداخلت نہیں کی۔ جگر صاحب نے جو کچھ کیا۔ سیاست کے لئے اور
عابد علی خان کی بھلائی کے لئے کیا۔ جگر صاحب عابد علی خان صاحب کے گھر ہی
میں رہتے تھے۔ ایک چھوٹا سا پلنگ، ایک میز کرسی۔ میز کے روبرو بیدکا

تین نشستوں والا صوفہ تھا۔ کمرہ میں دو بڑی الماریاں تھیں جن میں اُردو انگریزی کی اہم اہم کتابیں تھیں۔ جگر صاحب عابد علی خان صاحب کے بڑے بھائی اور مثالی دوست کی طرح ساتھ رہے۔ گھر کے تمام افراد جگر صاحب سے بے حد محبت کرتے تھے گھر کے تمام افراد چچا کہہ کر مخاطب کرتے تھے اُن کی قدر و قیمت اور اُن کی عزت و احترام میں کبھی کمی نہیں کی۔ جگر صاحب نے شہر حیدرآباد کے بہت سے اہلِ قلم حضرات و خواتین کی علمی و ادبی صلاحیتوں کو محسوس کرتے ہوئے سیاست اخبار کے ذریعہ ان کو شہرت دلوائی۔ اُن کے مضامین شائع کئے اُن کی شاعری سیاست میں شائع ہوتی رہی۔ انہوں نے اپنی دن رات کی محنت سے سیاست اخبار کو اس قابل بنا یا کہ معمولی ہو کہ غیر معمولی اہلِ قلم سیاست میں اپنی تخلیقات کی اشاعت پر فخر محسوس کرتا تھا۔ جگر صاحب اور عابد علی خان صاحب کی سرپرستی نے ہی مجھے اس قابل بنایا ہے کہ آج شعروادب کے میدان میں میں اپنی شناخت رکھتا ہوں۔ سیاست میں میری بے شمار غزلیں، انٹرویوز، فیچرز، تبصرے اور مضامین شائع ہوتے رہے۔ جگر صاحب مختلف نوعیت کے ادبی کام مجھ سے لیتے اور الحمد اللہ میں نے اپنے فرائضِ منصبی کی تکمیل میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ تمام ادبی دنیا جگر صاحب کے نام اور ان کے کام سے واقف ہے، جگر صاحب، نہایت سیکولر، کھلے دل و دماغ کے انسان تھے انہوں نے حیدرآباد حیدرآبادی تہذیب اور یہاں کے ماحول سے اپنے آپ کو وابستہ کر لیا تھا اور تادمِ حیات وابستہ رہے۔ نہایت اعلیٰ ظرف، بلند مرتبت شخصیت کے

حامل تھے ۔ جگر صاحب نے اپنی اور سیاست کی معرفت، شہر کی شعری و ادبی علمی و فلاحی، تہذیبی و ثقافتی غیر معمولی خدمات انجام دی ہیں جس کسی شاعر یا ادیب میں تھوڑی بھی لکھنے کی صلاحیت ہوتی تو اس کی سرپرستی کرتے تھے ۔ بعض نئے لکھنے والوں کو عنوانات دے کر لکھواتے تھے ۔ جگر صاحب نے حیدرآباد میں اردو ہندی کے خوشگوار ماحول کو ہمیشہ برقرار رکھا ۔ ہندی شاعروں ' ادیبوں کے علاوہ تلگو کے قلمکاروں کی تخلیقات بھی شائع کیں ۔ دیگر زبانوں کے شاعروں ، ادیبوں کی بھی سرپرستی کی جگر صاحب نے سیاست میں نظم و ضبط کو پوری توجہ کے ساتھ برقرار رکھا سیاست میں جگر صاحب کی بدولت جو نظم و ضبط تھا اس کی غیر معمولی شہرت آج بھی ہے ۔ جگر صاحب بے حد رحم دل ، رقیق القلب اور نیک انسان تھے ۔ ہر روز صبح تلاوت کلام پاک کرتے تھے تہجد کی نماز کبھی ناغہ نہیں ہوتی تھی انہوں نے اپنی زندگی میں بہت سے ضرورت مندوں کی اس طرح مدد کی کہ دائیں ہاتھ کی بائیں ہاتھ کو خبر نہیں ہوتی تھی ۔

اس مختصر سے مضمون میں جگر صاحب کی شخصیت اور ان کی خدمات کا احاطہ کرنا ممکن نہیں ہے میں نے جتنی باتیں کہی ہیں وہ سب کی سب سائیان (محبوب حسین جگر ۱۹۹۸ء) میں درج ہیں ۔ جگر صاحب مجھے اکثر و بیشتر بے ساختگی کے ساتھ یاد آتے ہیں ۔ مجھے یقین ہے کہ رب العالمین اپنے اس نیک بندہ پر خاص مہربان ہوگا ۔ جگر صاحب جیسے لوگ برسوں بعد پیدا ہوتے ہیں ۔ ہر مشکل وقت میں جگر صاحب بہت سوں کے

کام آتے رہے۔ بیسیوں واقعات ایسے ہیں جو ناقابلِ فراموش ہیں جگر صاحب کی تعریف و توصیف کے لئے الفاظ نہیں ملتے۔ میں اپنے آپ کو بے حد خوش نصیب سمجھتا ہوں کہ مجھے جگر صاحب اور شاید علی خان صاحب جیسی نامور شخصیتوں کی سرپرستی حاصل رہی۔ آج میں جس مقام پر ٹھہرا ہوں وہ انہیں شخصیتوں کے بدولت ہے۔ یہ دونوں شخصیتیں میری ذہنی تربیت اور میری شخصیت کی نشوونما میں ہمیشہ دلچسپی لیتی رہیں میں تاحیات اُن کا احسان مند رہوں گا۔

ڈاکٹر حسینی شاہد

(ممتاز ماہرِ تعلیم شفیق استاد نامور ادیب)

بین کلیاتی اُردو فیسٹول (۱۹۵۹ء) کے سلسلے میں انتخابات کی تیاریاں زور و شور سے جاری تھیں۔ ایک شام صدرِ بزمِ اُردو آرٹس کالج (جامعۂ عثمانیہ) مسعود متین اور معتمد بزمِ اُردو سیف آباد سائنس کالج الطاف حسین مجھ سے ملنے کے لئے اورینٹل اُردو کالج آئے۔ الطاف حسین نے مجھ سے خواہش کی کہ میں بین کلیاتی اُردو فیسٹول کے عہدۂ صدارت کے لئے مسعود متین کو ووٹ دوں میں اُس وقت اورینٹل ہائر اُردو کالج کی بزمِ اُردو کا صدر تھا۔ بین کلیاتی اردو فیسٹول کا یہ طریقۂ کار تھا کہ شہر کے تمام کالجس کے صدورِ بزمِ اُردو اپنی اپنی پسند کے ایک امیدوار کو صدر بین کلیاتی اُردو فیسٹول منتخب کرتے تھے اُن دونوں کی واپسی کے بعد استاذ المحترم ڈاکٹر حسینی شاہد نے مجھ سے کہا کہ تم خود کیوں صدارتی امیدوار کی حیثیت سے میدان میں نہیں اُترتے۔ ڈاکٹر صاحب کا مشورہ اچھا تھا لیکن یہ مشورہ میرے لئے موزوں نہیں تھا اس

لئے کہ میں انتخابات کی ہنگامہ آرائیوں سے بہت دور رہنا چاہتا تھا۔ ڈاکٹر حسینی شاہد میرے بہترین استاد تھے۔ بی او ایل کے طلباء کو تنقید پڑھاتے تھے پروفیسر ابوظفر عبدالواحد کالج کے پرنسپل تھے۔ میری ہی نہیں ڈاکٹر حسینی شاہد صاحب کی بھی یہ خواہش تھی کہ شہر کے تمام کالجس کے مقابلے میں اورینٹل اُردو کالج کی علمی، ادبی و تہذیبی سرگرمیاں کچھ زیادہ ہی عروج پر رہیں۔ ڈاکٹر صاحب اورینٹل اُردو کالج کی بزم اُردو کے مشیر تھے۔ میں اُن کے بہترین شاگردوں میں شمار کیا جاتا تھا۔ میرے دل میں یہ بات جاگزیں تھی کہ اورینٹل اُردو کالج کا نام مختلف تہذیبی و ادبی سرگرمیوں کے ساتھ روشن رہے۔ چنانچہ میں اپنے اساتذہ کی سرپرستی اور اپنے رفقائے کار کے تعاون سے آئے دن کچھ نہ کچھ ادبی سرگرمیوں کے لئے راہ فراہم کرتا رہا۔ اورینٹل اُردو کالج کی بزم کی جانب سے بین کلیاتی تحریری و تقریری و بیت بازی کے مقابلے ہوتے تھے تحریری اور تقریری مقابلوں اور بیت بازی کے لئے بھی میں ممکنہ تعاون پیش کرتا۔ محفل شعر و سخن کا بھی اہتمام ہوتا تھا۔ محفل شعر اور ادبی و تہذیبی پروگرام بھی آراستہ کیے جاتے۔ جب میں نے بی او ایل سال اول میں داخلہ لیا تو اُس وقت پروفیسر ابوظفر عبدالواحد اورینٹل اُردو کالج کے پرنسپل تھے۔ اساتذہ میں ڈاکٹر حسینی شاہد، ڈاکٹر زینت ساجدہ، ڈاکٹر مغنی تبسم، منظور احمد، سعادت نظیر بھی شامل تھے۔ بزم اُردو اورینٹل اُردو کالج کے انتخابات میں، میں بلامقابلہ صدر بزم اُردو منتخب ہوا۔ ہاشم جہاجر کا سکریٹری کی حیثیت سے انتخاب عمل میں آیا۔ میں

نے بزم اُردو کی سرگرمیوں کو تیز تر کر دیا تھا۔ شاہد صاحب بہت خوش ہوتے تھے اُردو بیتیں اُردو کالج میں دوسرے اساتذہ کی طرح ڈاکٹر صاحب بھی اعزازی طور پر خدمت انجام دیتے تھے تمام اساتذہ کے پڑھانے کا انداز جداگانہ تھا۔ پروفیسر ابوظفر عبدالواحد کی کلاس بڑی دلچسپ رہتی تھی۔ شعری ادب کے علاوہ انگریزی ادب کی کلاسس بھی لیتے تھے ظفر صاحب ہمیشہ ٹہلتے ہوئے لیکچر دیا کرتے تھے بلکہ پوری کلاس میں گردش کرتے ہوئے پڑھاتے تھے دوران لیکچر عمدہ لطائف سناتے تھے۔ ہم طلباء سے کبھی کبھی شعر سنتے تھے۔ اُردو کالج میں میرے ہم جماعت ایک حافظ صاحب بھی تھے۔ ظفر صاحب کی خواہش پر ایک دفعہ محفلِ شعر منعقد ہوئی تھی۔ حافظ صاحب نے کہا کہ سر! میں بھی کچھ شعر سنانا چاہتا ہوں۔ ظفر صاحب نے فرمایا ضرور برخوردار۔ حافظ صاحب نے کہا رباعی پیش ہے رباعی پر ظفر صاحب چونک گئے۔ حافظ صاحب نے پہلا مصرعہ سنایا جو ساقط البحر تھا دوسرا مصرعہ سنایا وہ بھی ساقط البحر تھا۔ تیسرا مصرعہ بھی وزن سے گرا ہوا تھا اور چوتھا مصرعہ بھی وزن سے خارج تھا۔ حافظ صاحب ایک الگ بنچ پر بیٹھے ہوئے تھے ظفر صاحب ان کے قریب پہونچے اور کان پکڑ کر کہا برخوردار! یہ رباعی ہے؟ کس نے کہا تمہیں شاعری کرنے کے لئے۔ کان پکڑلو۔ توبہ کرو اور قسم کھاؤ کہ شاعری نہیں کروگے۔

ڈاکٹر حسینی شاہد ترقی پسند ادیب تھے انجمن ترقی پسند مصنفین حیدرآباد سے انہیں کافی دلچسپی رہی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے جب پہلی دفعہ

انجمن ترقی پسند مصنفین کا احیاء کیا تو مہر حسن صدر، ڈاکٹر حسینی شاہد معتمد اور
ناصر کرنولی شریک معتمد تھے۔ لیکن انجمن زیادہ عرصہ تک سرگرم عمل نہ رہ سکی
پھر ۱ برس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے انجمن کا دوبارہ احیاء کیا۔ اُردو ہال میں
شاعروں، ادیبوں کو مدعو کیا۔ اڈھاک کمیٹی بنائی گئی۔ اجلاس میں راشد آذر
کو معتمد انجمن چنے اور نصرت محی الدین کو شریک معتمد منتخب کیا گیا۔ اڈھاک
کمیٹی بننے کے کچھ ہی دن بعد باضابطہ انتخابات ہوئے جس میں اڈھاک کمیٹی
کے عہدہ دار ہی اپنے اپنے عہدوں پر دو سال کے لئے منتخب کیے گئے۔ انجمن د
کے جلسے پہلے اُردو ہال میں ہوتے رہے۔ کچھ جلسے اسٹیٹ بنک آف حیدرآبا
کے میٹنگ ہال میں ہوتے رہے۔ بعد میں ہنری مارٹن انسٹیٹیوٹ میں ہونے
لگے۔ میں تقریباً چھ برس تک شریک معتمد رہا۔ طریقۂ کار کے مطابق ڈاکٹر
راج بہادر گوڑ انجمن کے عہدہ داران و ارکانِ عاملہ کا پیانل پیش کرتے تھے انجمن
کے احیاء کے بعد صدر کے عہدہ پر عاتق شاہ اور نجمہ نکہت فائز رہے۔ جب
تک راشد آذر اور میں انجمن سے وابستہ رہے نہایت پابندی کے ساتھ انجمن
کے جلسے ہوا کرتے تھے۔ ڈاکٹر حسینی شاہد صاحب انجمن ترقی اُردو کے
سکریٹری کی حیثیت سے بھی نمایاں کام کرتے رہے۔ مولوی حبیب الرحمٰن
انجمن کے صدر تھے حبیب الرحمٰن صاحب، ڈاکٹر حسینی شاہد کو بے انتہا
چاہتے تھے شاہد صاحب بھی حبیب صاحب کا بے حد احترام کرتے تھے مولوی
حبیب الرحمٰن صاحب نے پولیس ایکشن کے بعد حیدرآباد میں اُردو کے
تحفظ و بقا اسکے فروغ کے لئے اپنی سرگرمیوں کو جاری رکھا تھا

آندھرا پردیش کے قیام کے بعد اردو کو اس کا مستحقہ مقام دلانے کے لئے بے نکان خدمات انجام دیتے رہے۔ برسوں انجمن کے سکریٹری رہے۔ اس زمانے میں نواب میر احمد علی خان صاحب صدر انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش تھے۔ جناب عابد علی خان، ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، ڈاکٹر سید عبدالمنان اور سری نواس لاہوٹی کی رفاقت نے بھی انجمن کی سرگرمیوں کو فروغ دینے میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ انجمن کی سرکردگی میں پہلے اردو اورینٹل کالج اس کے بعد اردو آرٹس کالج کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اسی زمانے میں کالج آف لنگویجس کا قیام عمل میں آیا۔ ہاشم حسن سعید جو بعد میں اس کالج کے پرنسپل رہے۔ کالج کے معماروں میں سے ایک ہیں جس کو انہوں نے ناگفتہ بہ حالات کے باوجود اپنی شبانہ روز کوششوں سے کالج کو ترقی دی۔ یہاں یہ بات میں واضح کرتا چلوں کہ کالج کے لئے سرکاری امداد کے حصول کے سلسلے میں وہ بہ پابندی سکریٹریٹ آیا کرتے تھے اور جب بھی وہ مجھ سے ملا کرتے میں نے ان کی مدد کی۔ جس کسی ڈپارٹمنٹ میں فائل جاتی وہاں انہیں میرا تعاون حاصل ہوتا تھا جس کی وجہ سے ایک ایسے دور میں جبکہ حکومت نے کسی بھی تعلیمی ادارے کو امداد جاری نہ کرنے کا فیصلہ کر رکھا تھا اس کالج کو امدادی کالج کے زمرہ میں شامل کر کے مستقل بنیادوں پر گرانٹ جاری کی گئی۔ ہاشم حسن سعید کی کوششوں کی وجہ سے کالج کو مستحکم حیثیت حاصل ہوئی۔ مولوی حبیب الرحمن نے اردو ہال اورینٹل اردو کالج اور اردو آرٹس کالج کی عمارتوں کے لئے اپنی ذاتی زمین عطا کی جہاں پر یہ واقع عمارت اب گلشن حبیب کے نام سے موسوم ہے حبیب الرحمن صاحب پاکستان

منتقل ہونے سے پہلے اردو ھال کی عمارت کے ایک حصہ میں جہاں اب انیس الرحمٰن بلاک ہے سکونت پذیر تھے۔ اردو مجلس کے سکریٹری کی حیثیت سے مجھے مولوی حبیب الرحمٰن صاحب کی بھرپور سرپرستی حاصل رہی۔ میں اردو مجلس کا ۸ ایرس تک معتمد رہا۔ حبیب الرحمٰن صاحب اردو مجلس کے صدر تھے۔ ان کے بعد ڈاکٹر حسینی شاہد صدر رہے۔ ان کی زیر نگرانی اردو مجلس کے پروگرام کی صورت گری کی جاتی تھی۔ حسینی شاہد صاحب نے انجمن ترقی اردو اور نیشنل اردو کالج اور اردو آرٹس کالج کی سرگرمیوں کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا۔ اردو آرٹس کالج کے لئے جب مالیہ کا بحران پیدا ہوا تو عابد علی خان صاحب نے جو اس وقت انجمن کے نائب صدر تھے۔ ادبی ٹرسٹ کے مشاعرہ کی آمدنی میں سے زائد از ایک لاکھ روپیہ اردو آرٹس کالج کے لئے دیا تھا۔ وہ بہت بڑا مشاعرہ تھا جس میں بیرون ملک بھر کے نامور شاعروں نے شرکت کی تھی۔ اس مشاعرہ میں میں بھی مدعو تھا حسنِ اتفاق سے میری غزل بہت پسند کی گئی۔ جب میں کلام سنا کر بیٹھ گیا تو استاد المحترم ڈاکٹر حسینی شاہد نے میری پیٹھ تھپکتے ہوئے مبارکباد دی۔ ڈاکٹر صاحب کی خواہش پر میں نے انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام منعقدہ اضلاع کے کئی مشاعروں میں شرکت کی ہے وہ اضلاع کے مشاعروں میں لازماً مجھے مدعو کرتے تھے سری نواس لاہوٹی شریک معتمد انجمن ان کے رفیق کار تھے ڈاکٹر صاحب اپنی زمین (حیدرآباد) سے بے انتہا محبت کرتے تھے ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کی طرح حیدرآبادیت ان کے جسم و جاں کا ایک اہم حصہ بنی ہوئی تھی ڈاکٹر صاحب نے بدر عہ کا کالج میں بھی بہ حیثیت لکچرر کام کیا۔ پیشۂ صحافت

سے بھی ان کا تعلق رہا۔ شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ سے زیر نگرانی ڈاکٹر مسعود حسین خان صاحب صدر شعبۂ اردو پی ایچ ڈی کے لئے مقالہ لکھا "سید شاہ امین الدین علی اعلیٰ حیات اور کارنامے" کے زیر عنوان ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ ان کا یہ مقالہ کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے۔ اس کتاب کی کتابت مشہور خوشنویس عارف الدین نے کی تھی۔ عارف صاحب کا بیان ہے کہ کتابت کی اجرت کے سلسلے میں کبھی بھی ڈاکٹر صاحب نے اجرت کا تعین نہیں کیا۔ مقررہ اجرت سے بڑھ کر وہ معاوضہ دیتے تھے۔ ایسے معاملات میں بھی وہ نہایت فراخ دل واقع ہوئے تھے وہ سچے اور کھرے انسان تھے تاحیات انجمن ترقی اردو کے سکریٹری کی حیثیت سے اعزازی طور پر کام کرتے رہے ان کے انتقال کے بعد عبدالرحیم خان شریک معتمد انجمن، انجمن ترقی اردو کے سکریٹری منتخب ہوئے ڈاکٹر سید عبدالمنان اس وقت انجمن کے صدر ہیں اور جناب عبدالرحیم خان صاحب معتمد۔ ڈاکٹر حسینی شاہد کی شریک حیات نامور صاحب طرز ادیبہ ڈاکٹر زینت ساجدہ کی رفاقت نے ڈاکٹر صاحب کا بہت زیادہ ساتھ دیا۔ ان دونوں دانشوران اردو نے زبان وادب کو بہت کچھ دیا ہے بی اے میں اچھی پوزیشن کے ساتھ کامیابی حاصل کرنے کے بعد میں نے ایم اے میں داخلہ لیا جب میں مشاعروں کے سلسلے میں زیادہ مصروف رہتا تو شاہد صاحب فرماتے کہ ایم اے کا امتحان بہت مشکل ہوتا ہے محنت کا طالب رہتا ہے اگر تم مشاعروں میں الجھتے رہو گے تو کامیاب نہ ہو سکو گے۔ میں نے اپنے استاد المحترم کو یقین دلایا کہ میں آپ کی دعاؤں اور اپنی محنت کے طفیل ضرور کامیاب ہو جاؤں گا

الحمدللہ میں امتحان میں اچھے نمبرات کے ساتھ پاس ہوگیا۔ ایم اے اول میں میری استاد نامور طنز و مزاح نگار پروفیسر حبیب ضیاء بھی تھیں ۔ بین کلیاتی اردو فیسٹول کے سارے اجلاس پروفیسر عبدالقادر سروری صدر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ کے دولت خانہ واقع حمایت نگر میں ہوتے تھے مختلف کالجس کے صدر و معتمدین اجلاس میں شرکت کرتے تھے۔ سروری صاحب کی زیر نگرانی ایک اجلاس میں، مجھے بین کلیاتی اردو فیسٹول کا بلا مقابلہ معتمد مشاعرہ بنایا گیا۔ اردو فیسٹول (۱۹۵۹ء) سے پہلے پروفیسر سروری کی رہائش گاہ پر منعقدہ مشاعروں میں شہر کے نامور شاعروں کے ساتھ ساتھ میں بھی شریک رہا کرتا تھا۔ بعض مشاعروں کی میں نے نظامت بھی کی ہے۔ اس زمانے میں مشاعرہ کی کارروائی چلانے والے کو معتمد مشاعرہ کہا جاتا تھا نہ کہ ناظم مشاعرہ۔ ان محفلوں میں ڈاکٹر مصطفیٰ کمال (طالب علم سائنس کالج) کے علاوہ ابوالفیض سحر بھی موجود رہتے تھے۔ ابوالفیض سحر ان دنوں ایک رسالہ "فضاء" کے نام سے شائع کرتے تھے۔ جامعہ عثمانیہ سے اردو میں ایم اے کر رہے تھے۔

نظام کالج گراونڈ میں اردو فیسٹول کی تقاریب منعقد ہوتی تھیں اردو فیسٹول ۱۹۵۹ء کے مشاعرہ کی صدارت شاہد صدیقی صاحب نے کی تھی منظور احمد منظور مشاعرہ کمیٹی کے منشیر تھے اپنے انداز کا وہ ایک آخری فیسٹول تھا۔ پروفیسر مغنی تبسم، محفلِ موسیقی کے منشیر تھے محفلِ موسیقی میں حصہ لینے کے لئے مجھے جب میرے بعض احباب نے مشورہ دیا تو مغنی تبسم صاحب نے فرمایا تھا تم شاعر ہو گلوکار نہیں تم اکثر ترنم میں کلام سناتے ہو تمہارا

ترنم اچھا ہے ترنم سے ہی کلام سناتے رہو۔ ڈاکٹر حسینی شاہد صاحب اُردو
کالج کی ادبی و تہذیبی سرگرمیوں کا بہ غور جائزہ لیتے تھے نظام کالج میں
بین کلیاتی مقابلہ شعر و سخن ہوا تھا جس میں میری غزل کو انعام اول کا مستحق
قرار دیا گیا۔ اور مجھے سید سجاد شیلڈ دی گئی۔ شاہد صاحب میری کامیابی
پر بے حد خوش ہوئے۔ اُس وقت کے مقابلے میں ڈاکٹر اشرف رفیع، سیدہ مجیدہ
طالب خوندمیری اور سید علی خیال بھی تھے۔ اردو مجلس کی میری معتمدی کے
آخری زمانے میں بھی شاہد صاحب کی یہ خواہش رہتی کہ اچھے اچھے ادبی پروگرام
ترتیب دیئے جاتے رہیں۔ ہر ماہ کے پروگرام کے سلسلے میں شاہد صاحب
کا مشورہ مجھے حاصل ہوتا۔ شاہد صاحب اجلاس کے آخر تک تشریف رکھتے۔
اب اس طرح کے اساتذہ کا ذکر آتا ہے تو وہ دور آنکھوں میں دیدۂ پرنم
کی طرح جھلملاتا ہے اور وہ سب ایک خواب سا نظر آتا ہے۔

بھارت چند کھنہ

ممتاز طنز و مزاح نگار، مہذب انسان

ایک ایسے دور میں جب سارا معاشرہ ہی انتشار کا شکار ہو
ہو اور ایک ایسے دور میں جب ایک دوسرے پر سے اعتماد ہی اُٹھ
گیا ہو تو ایسے حالات میں شریف لوگوں کی تلاش ایک مشکل مسئلہ بن
جاتی ہے پھر بھی بعض لوگ اس قدر پاک و صاف اور سیدھے سادے
ہوتے ہیں کہ ان کی زندگی میں کسی بھی قسم کا پیچ بھاؤ نہیں ہوتا۔ اگر
کوئی مجھ سے یہ پوچھے کہ اس شہر کے کچھ برسوں پہلے تک کون کون
ایسے لوگ تھے جنہیں شرافت، مروت، ہمدردی اور رواداری کا
پیکر کہا جاتا تو میں اپنے تعلقات و تجربات کی بناء پر بلا تامل ممتاز
طنز و مزاح نگار بھارت چند کھنہ صاحب کا بھی نام لوں گا جہاں کہیں
بھی سلجھے ہوئے معتبر لوگوں کا ذکر ہوگا وہاں بھارت چند کھنہ کا
نام بھی لیا جائے گا۔ شہر کا ادبی و تہذیبی حلقہ کھنہ صاحب کی ادیبانہ
شان و شوکت اور ان کی تحریروں کی اہمیت سے واقف ہے۔ بھارت چند کھنہ

حیدر آباد کی ان باوقار و قابل قدر شخصیتوں میں سے ایک تھے جن سے
گفتگو کرتے ہوئے ایک طرح کی مسرت محسوس ہوتی تھی۔ میں کھنہ صاحب
کی بے حد عزت کرتا تھا آج بھی جہاں کہیں ان کی بات نکلتی ہے تو دل کی
گہرائیوں سے ان کی شرافت اور ان کی عظمتوں کو خراج پیش کرتا ہوں
کھنہ صاحب حیدر آباد کے ایک اعلیٰ کائستھ گھرانے کے چشم و چراغ
تھے اردو ادب کی دنیا میں انہوں نے اپنی شگفتہ طربیہ، مزاحیہ و
طنزیہ تحریروں سے اپنی شناخت بنائی تھی۔ بہت ہی عمدہ طنز و مزاح نگار
تھے آج سے ۴۰ برس پہلے زندہ دلان حیدر آباد کا قیام عمل میں آیا تھا
۱۹۶۶ء میں زندہ دلان کی پہلی کل ہند کانفرنس حیدر آباد میں منعقد ہوئی
تھی جس میں ملک بھر کے بڑے بڑے دانشوروں نے خاص طور پر کرشن چندر
فرقت کاکوروی، دلاور فگار، یوسف ناظم، احمد جمال پاشاہ، سرور جمال پاشاہ
سلمیٰ صدیقی اور دیگر مشاہیر نے شرکت کی تھی وہ نہایت یادگار کانفرنس
رہی۔ اس موقع پر ناصر کرنولی کی ادارت میں شائع ہونے والے ادبی
رسالہ پونم کا خاص نمبر شائع ہوا تھا مجلس عاملہ نے مجھے رابطہ کمیٹی کا
صدر نشین نامزد کیا تھا مجتبیٰ حسین جنرل سکریٹری تھے اس کانفرنس کے روح رواں
حمایت اللہ بھی تھے ان کے علاوہ ڈاکٹر مصطفیٰ کمال، ناصر کرنولی، حفیظ قیصر اور
دیگر ارکان نے اپنا بھرپور تعاون دیا تھا تمام عہدہ داران اور ارکان نے اپنی
اپنی ذمہ داریوں کو سلیقے سے نبھایا تھا۔

بھارت چند کھنہ صاحب سکریٹریٹ میں محکمہ جنرل اڈمنسٹریشن میں

ڈپٹی سکریٹری تھے کمشنر لیبر کی حیثیت سے بھی انہوں نے خدمات انجام دیں۔ گورنر آندھرا پردیش کے سکریٹری بھی رہے۔ میں بھارت چند کھنہ صاحب کی شخصیت، شرافت اور ان کی تحریروں سے متاثر تھا آج سے ۳۰ برس پہلے پاسپورٹ کی اجرائی کے سلسلے میں متعلقہ فارم کے اندراجات پر کسی ڈپٹی سکریٹری کی تصدیق ضروری تھی۔ کھنہ صاحب نے اپنے عہدہ سے بہت سوں کو فیض پہونچایا۔ ادبی رسالہ خاتون دکن شائع ہوا تو میں اس رسالہ کا مدیر اعزازی تھا مضامین کی حصول کے سلسلے میں کھنہ صاحب سے ملاقات ہوتی تھی۔ کھنہ صاحب کے مضامین "سیاست" میں بھی اہتمام کے ساتھ شائع ہوتے تھے شہر اور بیرون شہر کے ادبی حلقے کھنہ صاحب کی مزاحیہ تحریروں سے مانوس تھے۔ کھنہ صاحب کے طنز و ظرافت کے موضوع پر مضامین کا مجموعہ "زیر لب" ہے پہلی کتاب "نیم کش" ادارۂ ادبیات اردو کے زیر اہتمام "ذرا مسکرا دو" کے نام سے کتاب شائع ہو چکی ہے۔ پاسپورٹ فارم کے اندراجات کی تصدیق کے سلسلے میں کھنہ صاحب مجھ پر بہت اعتماد کرتے تھے۔ میں نے کئی نوجوانوں کے پاسپورٹ فارم پر کھنہ صاحب کی تصدیق حاصل کی ہے کھنہ صاحب جس زمانے میں سکریٹری گورنر آندھرا پردیش تھے اس وقت میں بھی راج بھون میں ان سے ملاقات کرتا تھا ایک نوجوان نے سکریٹریٹ میں مل کر مجھ سے تعاون کی خواہش کی۔ میں اس نوجوان کو اپنے ہمراہ لے کر راج بھون پہونچا۔ میں نے اپنا وزیٹنگ کارڈ بھجوایا۔ کھنہ صاحب

دروازہ تک آئے مجھے لینے کے لئے اور کہا کہئے کیسے آنا ہوا۔ میں نے کہا ایک نوجوان کے پاسپورٹ فارم پر آپ کی تصدیق درکار ہے۔ میں نے فارم پیش کیا اور کہا کہ وہ لڑکا وزیٹر روم میں بیٹھا ہوا ہے آپ کہیں تو بلوا لوں؟ کھنہ صاحب نے فرمایا اس کی ضرورت نہیں ہے آپ آئے ہیں یہی کافی ہے۔ میں چاہتا تھا کہ کھنہ صاحب متعلقہ نوجوان کو ایک نظر دیکھ لیں لیکن اُنہیں مجھ پر اعتبار تھا کہ میں کبھی غلط سفارش نہیں کرنا۔ کھنہ صاحب نے نہ جانے کتنے اہلِ غرض حضرات کے ساتھ اس طرح کا تعاون کیا ہوگا۔ بھارت چند کھنہ صاحب جس زمانے میں محکمہ R.T.O کے کمشنر تھے اُس وقت بھی انہوں نے ایک شخص کی جناب عابد علیخان صاحب کی سفارش پر بھرپور مدد کی تھی جو اپنی ملازمت کی بعض الجھنوں سے بے حد پریشان تھا۔ کھنہ صاحب سکریٹریٹ اُردو اسوسی ایشن کے صدر بھی رہے۔ سکریٹریٹ اُردو اسوسی ایشن کے قیام سے پہلے سکریٹریٹ میں کوئی اُردو انجمن نہیں تھی۔ بھارت چند کھنہ صاحب سکریٹریٹ اُردو اسوسی ایشن کے پہلے صدر تھے۔ میں نے صدارت کے عہدہ کے لئے فون پر اُن کی رضامندی حاصل کی تھی۔ ہوا یوں تھا کہ سکریٹریٹ اُردو اسوسی ایشن کے قیام کا جب وقت آیا تو میری نظر عہدۂ صدارت کے لئے کھنہ صاحب پر پڑی۔ سکریٹریٹ اسوسی ایشن کا قیام بھی ایک کرشمہ سے کم نہ تھا۔ اُس زمانے میں آل انڈیا ریڈیو (اُردو سکشن) کے اربابِ مجاز نے شہر کی ادبی انجمنوں کے لئے ورائٹی پروگرام کا آغاز کیا تھا میں اپنے کلام شاعر پروگرام کی ریکارڈنگ کے لئے آل انڈیا ریڈیو گیا تھا۔

اُردو سکشن کے پروگرام اگزیکیٹو مسٹر پانترو سے میرے دوستانہ مراسم تھے اُس وقت دورانِ گفتگو انہوں نے کہا سکریٹریٹ میں اُردو سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے اُردو پروگرام دیا جا سکتا ہے جس کے لئے ضروری ہے کہ کوئی اسوسی ایشن ہو کنٹراکٹ فارم اسوسی ایشن کے نام روانہ کیا جائے گا۔
مسٹر پانترو کے مشورہ کو روبہ عمل لانے کے لئے میں نے اپنے محکمہ (پنچایت راج ڈپارٹمنٹ) کے ساتھیوں، خواجہ بہاءالدین، افضل حسین، علیم الدین بی این ماتھر اور بھاکر کے علاوہ عباس ہاشمی (محکمہ تعلیمات) سے مشورہ کیا اور انجمن کے قیام کا تہیہ کر لیا۔ میری تحریک کا تمام ساتھیوں نے خیر مقدم کیا۔ اور میں کسی طرح آل انڈیا ریڈیو سے پروگرام حاصل کرنا چاہتا تھا۔
مجھے یاد ہے کہ یہ گفتگو لنچ کے دوران ہوم ڈپارٹمنٹ کے لئے عقب واقع سبزہ زار پر ہوئی تھی لنچ کے بعد اپنے احباب کی اجازت کے بعد D - 18۔ کے ایک سکشن میں پہونچا اور وہاں سے میں نے بھارت چند کھنہ کو فون کیا۔ وہ راج بھون میں، سکریٹری گورنر کے عہدہ پر فائز تھے۔ انجمن کے قیام کے بارے میں بتلایا میری خواہش پر انہوں نے اسوسی ایشن کی صدارت کا عہدہ قبول کیا۔ اسی طرح فون پر ہی میں نے مشہور کرکٹر غلام احمد صاحب اسسٹنٹ سکریٹری اور رشید قریشی صاحب اسسٹنٹ سکریٹری سے گفتگو کی اور انھیں نائب صدر کے عہدہ کے لئے آمادہ کر لیا۔ احباب نے مجھے جنرل سکریٹری اسوسی ایشن منتخب کیا۔ انجمن کا نام سکریٹریٹ اُردو اسوسی ایشن رکھا گیا۔ کھنہ صاحب جب تک زندہ رہے اسوسی ایشن کے صدر رہے۔ اُن کے زمانے میں اسوسی ایشن کے

بے شمار ادبی جلسے و مشاعرے ہوتے رہے۔ کھنہ صاحب اس قدر نفیس انسان تھے کہ وہ میری ہر تجویز کو پسند کرتے تھے لیکن میں اسوسی ایشن کے تمام پروگرام مسٹر غلام احمد صاحب، رشید قریشی صاحب اور دوسرے ارکان اسوسی ایشن کے مشوروں سے ہی ترتیب دیتا تھا۔ سکریٹریٹ اردو اسوسی ایشن کی سرگرمیوں کو تمام اردو حلقے قدر کی نگاہوں سے دیکھتے تھے بعد میں جب تک میں سکریٹریٹ میں رہا نہایت اہتمام کے ساتھ سکریٹریٹ اردو اسوسی ایشن کی سرگرمیاں جاری رہیں۔ وظیفہ حسنِ خدمت پر علیٰحدگی کے بعد بھی ایک عرصہ تک عملاً اسوسی ایشن کی سرگرمیوں کو فروغ دینے میں دلچسپی لیتا رہا۔ سکریٹریٹ اردو اسوسی ایشن کے پہلے سرپرست جناب ایس اے قادر چیف سکریٹری حکومت آندھرا پردیش تھے ان کے بعد اڈیشنل چیف سکریٹری راوٴ کنج بہاری لعل سرپرست رہے اور ان کے بعد چیف سکریٹری شری دین کمار سرپرست اسوسی ایشن رہے پہلے صدر بھارت چند کھنہ تھے ان کے بعد مختلف اوقات میں غلام احمد صاحب ایس اے واسع صاحب، صادق احمد صاحب اور سید تراب الحسن صاحب صدر رہے۔ میں قیام انجمن سے وظیفہ حسنِ خدمت تک اور اس کے بعد بھی جنرل سکریٹری رہا۔ کھنہ صاحب کو اردو زبان اور تہذیب سے غیر معمولی دلچسپی تھی کھنہ صاحب ریٹائر ہوئے تو رٹز ہوٹل کے سربراہ جو کھنہ صاحب کے دوست تھے انھیں رٹز ہوٹل کے شعبہٴ استقبالیہ کا انچارج مقرر کیا تھا کھنہ صاحب سے ملاقات کے لئے میں رٹز ہوٹل بھی جاتا تھا۔ ماہنامہ خاتونِ دکن کے لئے مضامین حاصل کرتا تھا جب بھی میں ان سے ملاقات

سے ہوٹل پہونچتا۔ فی الفور بلوا نے چائے بسکٹ سے تواضع کرتے
کفنہ صاحب وضع داری اور بردباری میں اپنی آپ مثال تھے ۱۷ دسمبر ۱۹۷۵ء میں
جب اردو اکیڈیمی کا قیام عمل میں آیا تو کفنہ صاحب سکریٹری بنے۔ حکومت
آندھرا پردیش نے جناب آصف پاشاہ وزیر قانون کو صدر کے عہدہ پر اور
جناب عابد علی خان صاحب مدیر سیاست کو صدر نشین مجلس عاملہ نامزد کیا
وہ زمانہ مسٹر وینگل راؤ کی چیف منسٹری کا تھا سکریٹریٹ کے قریب اے جی
آفس کے روبرو عمارت میں اکیڈیمی کا دفتر تھا کچھ مہینوں کے بعد جناب آصف
پاشاہ کی سرکاری رہائش گاہ ریڈہلز میں دفتر منتقل ہوگیا۔ عابد علی خان صاحب
دوپہر گھر جانے سے پہلے کچھ دیر کے لئے اکیڈیمی کے آفس جاتے اور ضروری
کاغذات پر تجاویز کرتے۔ پھر عابد علی خان صاحب ۴ بجے شام سیاست آفس
آجاتے تھے عابد علی خان صاحب کا کفنہ سے یہ روز کا معمول تھا عابد علی خان
صاحب کی خواہش پر چیف منسٹر نے کفنہ صاحب کا تقرر کیا تھا۔ جناب
عابد علی خان صاحب کے مشورہ پر میں بھی کبھی کبھی اکیڈیمی کے دفتر جاکر
وہاں کے اسٹاف کی جو ۳، ۴ افراد پر مشتمل تھا آفس کے کام کے سلسلے میں
رہنمائی کرتا تھا۔ کفنہ صاحب اپنی عمر کے آخری دنوں میں تقریباً گوشہ نشین
ہوگئے تھے محفلوں میں بہت کم شرکت کرتے تھے عابد علی خان صاحب سے
بجارت چند کفنہ صاحب کے خوشگوار مراسم تھے سیاست کے ایک مشہور کالم
"اچھے اشعار" پر انعامات کے جج بھی رہے۔ شہر کے بعض مخصوص
علمی و ادبی محفلوں میں شریک ہوا کرتے تھے وہ نہایت شائستہ انسان تھے

کھنہ صاحب کو ریس کھیلنے کا بہت شوق تھا لیکن اعتدال کے ساتھ۔ اپنی آفیسری کے زمانے میں ان کا سلوک اپنے ملازمین کے ساتھ نہایت عمدہ رہا۔ اپنے ماتحتین کے ساتھ نہایت مشفقانہ اور برادرانہ سلوک کرتے تھے کھنہ صاحب کی سکونت سکندرآباد میں تھی۔ حیدرآبادی تہذیب و شائستگی کی نمائندہ شخصیت تھے۔ ان کا لب ولہجہ نہایت سلجھا ہوا پُر وقار ہوتا تھا۔ کھنہ صاحب جیسے لوگوں کی جدائی عارضی ہوتی ہے دائمی نہیں۔ انہیں یاد کرنے والے اب بھی بہت سے لوگ موجود ہیں ان کی انسان دوستی اپنی آپ مثال تھی۔ کھنہ صاحب کی والہانہ وابستگی کو میں کبھی فراموش نہیں کرسکتا۔ ان کی یاد میرے علاوہ اُن کے بہت سے دوستوں کے دلوں میں اُجاگر ہے اب ایسے لوگ بہت کم ملتے ہیں جو دل و دماغ پر چھائے ہوئے رہتے ہیں۔

علامہ حیرت بدایونی

(کلاسیکی شاعری کے بلند مرتبت محترم شاعر)

حیدرآباد میں محفلِ شعر و سخن کی پُروقار فضا کو برقرار رکھنے اور اس کو پروان چڑھانے میں جہاں پرانے شہر کے شعرائے کرام، سرگرمِ عمل رہا کرتے تھے وہیں نئے شہر میں ہونے والے مشاعروں سے علامہ حیرت بدایونی بھی دلچسپی رکھتے تھے علامہ اگرچہ نہ تو کسی انجمن کے سربراہ تھے اور نہ ہی رکن لیکن ایک قابلِ قدر بزرگ شاعر کی حیثیت سے مشاعروں کی سرپرستی کیا کرتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یہ نہیں معلوم کہ حیدرآباد میں علامہ کے شاگردوں میں کون کون سے شاعر شامل تھے۔ البتہ میں نے یہ ضرور سُنا تھا کہ طالب رزاقی ان کے شاگرد تھے۔ یوگس حیدرآبادی کو بھی ان سے شرفِ تلمذ حاصل تھا علامہ حبیب نگر (ملے پلی) میں سکونت پذیر تھے۔ اس دور میں بھی جس طرح پرانے شہر میں مشاعروں کی بہتات تھی نئے شہر میں نہیں تھی۔ میں نے اپنی ابتدائی شاعری کے زمانے میں نئے اور پرانے شہر کے مشاعروں میں مدعو کیا

جاتا رہا ہوں۔ علامہ حیرت کے ہم عصروں میں پرانے شہر کے شاعروں میں علامہ نجم آفندی، مولانا شیخن احمد شطاری کامل، حضرت قدر عریضی اور تاج قریشی جیسے اساتذۂ سخن کے علاوہ اوج یعقوبی، خواجہ شوق ڈاکٹر علی احمد جلیلی، سعید شہیدی، طالب رزاقی، خیرات ندیم جیسے مقبول شاعر بھی شامل رہے ہیں نئے شہر کے نامور شعراء مخدوم محی الدین شاہد صدیقی، سلیمان اریب، کنول پرشاد کنول، شاذ تمکنت بھی علامہ کی شاعرانہ قدر و منزلت کو خراج پیش کرتے تھے۔

مجھے چونکہ علامہ حیرت بدایونی کی شخصیت اور ان کے شاعرانہ مرتبہ پر اظہار خیال کرنا ہے۔ اس لئے میں نے علامہ کو کس کس رنگ میں کہاں کہاں دیکھا ہے اپنے تجربات کی روشنی میں ان کی شخصیت اور شاعری پر روشنی ڈالنا ضروری سمجھتا ہوں۔ علامہ اپنے دور کے ایک مستند مقبول و مشہور شاعر تھے مہاراجہ سرکشن پرشاد صدر اعظم حیدرآباد دکن کے شاعرانہ دربار سے وابستہ تھے۔ علامہ کا کلام اخباروں اور رسائل میں بہت کم شائع ہوتا تھا۔ انہوں نے کبھی اپنے کلام کی اشاعت کے بارے میں دلچسپی نہیں لی۔ البتہ شہر کے اہم مشاعروں میں شریک رہتے تھے۔ علامہ کا انتقال ۱۹۷۵ء میں ہوا جبکہ ان کی عمر لگ بھگ ۸۰ سال کی تھی۔ ان کی زندگی تک بھی شہر کے مشاعروں کی فضاء نرم گرم ماحول کی ترجمانی کیا کرتی تھی۔ میں نے علامہ کی صدارت میں کئی مشاعرے پڑھے ہیں چاہے نئے شہر کے مشاعرے ہوں کہ پرانے شہر کے مشاعرے

علامہ نہایت وضع دار، باوقار، معتبر اور انسان دوست شخصیت
کے حامل تھے۔ مشاعروں میں وقت پر پہونچتے تھے۔ میں نے علامہ کو جب
کبھی مشاعروں کی صدارت کے لئے مدعو کیا تھا وہ بہ خوشی تشریف لاتے
تھے۔ میں جیسے ہی علامہ کے گھر پہنچتا چائے سے تواضع کی جاتی۔ شہر
کے مشاعروں کے بارے میں گفتگو رہتی اور مجھے ادبی ماحول میں اپنے وجود
کا احساس دلانے کی تلقین کیا کرتے تھے۔ علامہ حیرت صاف دل اور
کھلا ذہن رکھتے تھے۔ شہر کے تمام شاعروں سے ان کے تعلقات خوشگوار تھے
تمام شاعروں سے دوستانہ مراسم تھے علامہ حیرت کل ہند مرتبہ کے شاعر کی
حیثیت سے مشہور تھے شاعروں کے سلسلے میں جتنے بھی شاعر بیرون حیدرآباد
سے آتے علامہ سے ضرور ملاقات کرتے تھے ان کے دولت خانہ پر محفل شعر بھی
ہوتی تھی۔ جوش ملیح آبادی، جگر مرادآبادی جیسے عظیم شعراء بھی علامہ
سے ملنے ان کے گھر جاتے۔ شاہد صدیقی حیدرآباد کے ایک نغز گو
نامور شاعر تھے ان کے مزاج میں بلا کی بذلہ سنجی تھی۔ بات میں بات پیدا
کرنا ان کے لئے ایک معمولی سی بات تھی۔ علامہ سے ان کی چھیڑ چھاڑ
جاری رہتی۔ جوش صاحب بھی اپنے مخصوص رنگ میں علامہ سے مذاق
کیا کرتے۔ میں نے سنا ہے کہ علامہ کی توصیف میں جوش اور شاہد صدیقی
نے مخصوص لفظیات کے ساتھ ایک مشترکہ غزل لکھی تھی ۔

علامہ حیرت بدایونی جو نمبر شاعروں میں مجھے بہت چاہتے تھے ان کی خواہش رہتی کہ میں شہر کے بڑے اور معیاری مشاعروں میں اپنا کلام سنایا کروں۔ مجھے بنجارہ ہلز کا ایک مشاعرہ آج بھی یاد ہے۔ خان اقبال علاء الدین جو (محترمہ بلقیس علاء الدین کے شوہر محترم تھے) کی رہائش گاہ پر منعقد ہوا تھا علامہ مجھے اس مشاعرے میں اپنے ساتھ لے گئے تھے اس زمانے میں شہر کی صاف ستھری معزز شخصیتوں کی رہائش گاہوں پر محفلِ شعر و سخن آراستہ کرنے کا رواج تھا علامہ اس بات کا ضرور خیال رکھتے کہ جس کسی مشاعرہ کے وہ داعی ہوں یا ان کے ذمہ شعراء کا انتخاب ہو تو ایسے شاعروں کو ہی خصوصیت کے ساتھ مدعو کرتے تھے جو جام و مینا کے مشغلوں سے دور رہتے ہوں۔ علامہ کا ذوقِ شاعری نہایت نکھرا ستھرا تھا بہت عمدہ شعر کہتے تھے تحت میں کلام سنانے تھے پڑھنے کا انداز منفرد اور چھایا ہوا رہتا تھا علامہ کے دو شعری مجموعے ابریق (فارسی) اور آئینۂ اردو کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔ ان کے تمام بیٹے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں ممتاز عثمانین پروفیسر افضل محمد وائس چانسلر امبیڈکر یونیورسٹی ہیں۔ احمد جلیس ڈپٹی ڈائرکٹر دوردرشن بنگلور کے علاوہ ان کے دوسرے بیٹے بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ ان کی صاحبزادی پدم شری جیلانی بانو عالمی شہرت کی حامل افسانہ نگار و ناول نگار ہیں۔

علامہ حیرت بدایونی بے حد خوش نصیب باپ رہے ہیں۔

علامہ حیرت بدایونی جب شعر سناتے تھے تو سارے سامعین ان کی جانب پوری طرح سے متوجہ رہتے تھے شعر فہمی کا خوشگوار ماحول بھی ان کے ساتھ رہتا۔ مشاعروں میں خوب داد و تحسین سے نوازے جاتے۔ علامہ حیرت کئی برسوں تک صنعتی نمائش کے زیر اہتمام ہونے والے نمائش کلب کے مشاعروں کے صدر رہے۔ کئی برسوں تک معتمد مشاعرہ بھی رہے۔ نمائش کلب کے مشاعروں کے کنوینر شاہد صدیقی بھی رہے ہیں۔ علامہ حیرت بدایونی کے بعد صلاح الدین نیر معتمد مشاعرہ رہے اور گذشتہ ۲۵ برس سے یہ ذمہ داری نبھا رہے ہیں۔ میں جب پہلی دفعہ نمائش کلب کے مشاعرہ میں مدعو کیا گیا تو شاہد صدیقی معتمد مشاعرہ نے مشاعرہ میں شرکت کرنے کے لئے صرف تین سطری خط لکھا تھا۔ اس زمانے سے میں نمائش کلب کے مشاعرے پڑھ رہا ہوں۔ علامہ حیرت ادارۂ ادبیات کے مشاعروں میں بھی صدارت کیا کرتے تھے ان کے ڈاکٹر زور سے بہت اچھے مراسم تھے ادارۂ ادبیاتِ اردو میں یوم محمد قلی قطب شاہ تقاریب کے سالانہ مشاعروں کے علاوہ مختلف اوقات میں مشاعرے ہوتے تھے جب کبھی کوئی نامور شعراء حیدرآباد آتے تو ڈاکٹر زور مشاعرہ کا اہتمام کرتے تھے۔ علامہ حیرت انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام منعقدہ متعدد مشاعروں میں شریک رہتے بلکہ بیشتر مشاعروں کی صدارت کرتے تھے میں نے علامہ کے ساتھ بعض اضلاع کے مشاعرے بھی پڑھے ہیں جناب عابد علی خان کے دولت خانے پر ہونے والی محفلوں میں علامہ شریک رہتے۔ اگر مشاعرہ منعقد ہوتا اپنے بہترین کلام سے نوازتے تھے۔ مجھے بزم اردو الکٹریسٹی بورڈ

کی بزم اردو کی جانب سے منعقدہ ایک مشاعرہ کی یاد آرہی ہے علامہ حیرت نے صدارت کی تھی۔ اس مشاعرہ میں حیدرآباد کے نمائندہ شاعروں کو مدعو کیا گیا تھا مظفر النساء ناز اس مشاعرہ کی روح رواں تھیں سکریٹریٹ کی ملازمت کے بعد مظفر النساء ناز نے الکٹریسٹی بورڈ کی ملازمت اختیار کر لی تھی اس مشاعرہ میں بھی مظفر النساء ناز نے نہایت دلچسپی لی تھی۔ اس مشاعرہ میں علامہ نے غیر معمولی داد و تحسین حاصل کی تھی شعراء کے انتخاب میں مجھ سے بھی تعاون حاصل کیا گیا تھا۔ اس مشاعرہ میں میں نے تحت میں کلام سنایا تھا کیونکہ آواز ٹھیک نہیں تھی مشاعروں میں ہمیشہ ترنم میں ہی کلام سنایا کرتا ہوں مجھے یاد ہے اس مشاعرے میں میں نے یہ غزل سنائی تھی ؏

کیا شہر تھا کس طرح سے برباد ہوا ہے
قاتل کے سوا شہر میں اب کون بچا ہے

پرانے شہر کے مشاعروں میں خاص طور پر میرے استادِ محترم حضرت قدر عریضی کی رہائش گاہ پر منعقدہ مشاعروں میں علامہ حیرت ضرور شریک رہتے تھے علامہ کو میں نے حضرت کامل شطاری کی رہائش گاہ پر منعقدہ مشاعروں میں بھی سنا ہے علامہ نہایت مہذب شریف النفس انسان تھے نوجوان شعراء کی حوصلہ افزائی میں دلچسپی رکھتے تھے آدابِ مشاعرہ کو نہ صرف ملحوظ رکھتے تھے بلکہ دیگر شعراء سے بھی اسی طرح کی توقع رکھتے تھے جب میرا پہلا مجموعۂ کلام گلِ تازہ شائع ہوا تو بہت خوش ہوئے۔ میں نے ایک جلد اُن کے دولت خانہ پہونچ کر اُن کی خدمت میں پیش کی تھی

بہت بہت مبارکباد دی۔ مجھ سے علامہ نے اُس وقت یہ وعدہ کیا تھا کہ گلِ تازہ کی رسم اجراء تقریب میں تشریف لائیں گے علامہ حیرت رسم اجراء تقریب میں تشریف لائے تھے اردو ہال میں گلِ تازہ کی شاندار پیمانے پر رسم اجراء تقریب منعقد ہوئی تھی پروفیسر ابوظفر عبدالواحد پرنسپل اردو کالج نے رسم اجراء انجام دی تھی۔ اردو ہال تنگ دامنی کی شکایت کر رہا تھا علامہ کی شاعری کلاسیکی شعر و ادب سے تعلق رکھتی ہے ان کی شاعری کلاسیکی اقدار کی ترجمان ہے ان کا اسلوبِ شاعری اساتذۂ سخن کی نورِ بصیرت کا عکاس ہے فارسی شعر و ادب نے بھی علامہ کو با کمال شاعر بنا دیا تھا۔ مجھے ۱۹۶۰ء سے پہلے کے شہر کے شاعرانہ ماحول سے زیادہ واقفیت نہیں تھی۔ یقیناً اُس دور میں بھی علامہ نے اپنے جوہر دکھائے ہوں گے امجد حیدر آبادی، فانی بدایونی کے ساتھ کئی مشاعرے پڑھے ہوں گے۔ علامہ حیرت بدایونی کا انتقال ہوئے (۲۶) برس ہو چکے ہیں افسوس ہے کہ ہم اپنے بزرگوں کو بھولتے جا رہے ہیں انکی یاد تازہ رکھنے کے لئے ہم کوئی محفل آراستہ نہیں کرتے۔ لیکن شہر کی ایک ادبی انجمن ایسی ہے جو اوراقِ ماضی کے زیرِ عنوان اساتذۂ سخن، ادیبوں وغیرہ کی یاد میں جلسے منعقد کرتی ہے وہ ادبی انجمن ادارہ میرا شہر میرے لوگ ہے میں اس ادارہ کا صدر ہوں۔ اس ادارہ کے زیرِ اہتمام علامہ حیرت کے فن اور شخصیت کو خراج پیش کرنے کے لئے اوراقِ ماضی کے زیرِ عنوان مولانا ابوالکلام آزاد انسٹیٹیوٹ میں ادبی تقریب منعقد کی گئی تھی میری خواہش رہتی ہے کہ ہم اپنے مشاہیر اہلِ قلم حضرات کی یاد میں ادبی جلسے منعقد کریں۔ علامہ حیرت بھی ہمارے شہر کی ادبی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہیں گے ایسا مجھے یقین ہے۔

مخدوم محی الدینؒ

(انقلابی شاعر۔ نفیس انسان۔ طرح دار شخصیت)

مخدوم محی الدین جیسے انقلابی شاعر، نفیس انسان اور طرح دار شخصیت کے بارے میں سوچنا، ان کے بارے میں خامہ فرسائی کرنا، ان کی خوبیوں کے تذکروں سے ذہن و دل کو روشن رکھنا اور اس طرح کے عظیم انسان کی عظمتوں اور فضیلتوں کو خراج پیش کرنا ایک ایسی مسرت و انبساط کی بات ہے کہ جس سے جولانگاہ فکر کو نئی توانائی ملتی ہے بہت کم ایسے لوگ ہوتے ہیں جو نہ صرف آب رواں کی طرح فیض رساں ہوتے ہیں بلکہ جن کی خوشبو سارے ماحول کو مہکا دیتی ہے۔ مخدوم محی الدین صاحب کو اسی پس منظر میں یاد کیا جاتا ہے مخدوم محی الدین نہ صرف ایک لاجواب شاعر تھے بلکہ پُر خلوص و اعلیٰ درجہ کے باکردار انسان بھی تھے۔ معاشرہ کی صبح و شام کے ان لمحوں کے امین بھی تھے جو انسان کی عظمتوں کی پاسداری کیا کرتے تھے مخدوم صاحب نے کمیونسٹ لیڈر کی حیثیت سے بے شمار صعوبتیں برداشت کیں ظلم و استبداد کے خلاف

اپنی ہوا ز بلند کی اور اپنے اعلیٰ کردار کا ثبوت دیتے ہوئے فسطائی طاقتوں کے ساتھ مقابلہ کیا۔ کسے پتہ تھا کہ ایک ایسا شخص جس نے دینی ماحول میں آنکھیں کھولی ہو وہ ایک ایسے قائد کی طرح ابھرے گا جو دھرمے پرچم کو تھامنے کی بجائے لال پرچم کو تھامے گا۔ لال پرچم ظلم و ناانصافی استحصال و حق تلفی کے انسداد کے لئے ایک ایسی علامت ہے جو ہمیشہ کمزور و لاچاروں بے سہاروں اور سوسائٹی کے عدم توجہ کے شکار لوگوں کے لئے ایک مسیحائی کا کام کرتا ہے۔ اگر مخدوم محی الدین صاحب کے خیالات میں تبدیلی آتی تو یہ ممکن تھا کہ وہ دھرمے پرچم کو تھامے ہوئے ملت اسلامیہ میں بڑا نام کماتے مخدوم محی الدین صاحب نے کبھی عیش و آرام کی زندگی نہیں گزاری۔ ہمیشہ عوام کے زخموں پر مرہم رکھتے رہے ان کے دکھ درد، ان کے کرب و اذیت ان کی پریشانیوں اور مصیبتوں کو اپنا دوست بنایا اور ان کی فلاح و بہبود کے لئے سرگرم عمل رہے۔ اپنی شخصیت کے سحر سے کئی مظلوموں اور بے سہاروں کی مدد کی۔ ایک کمیونسٹ لیڈر انسانی رشتوں کے طرفدار اور بے غرض محسن کی طرح اپنی زندگی بسر کی۔ شاعر کی حیثیت سے ان کے کلام نے ساری ادبی دنیا کو چونکا کے رکھ دیا۔ سرخ سویرا کی نظموں نے ادبی دنیا میں ہلچل مچادی پھر گل تر اور بساطِ رقص کی اشاعت نے تو مخدوم محی الدین کی شاعرانہ فضیلت پر مہر تصدیق ثبت کردی۔ وہ شاعروں میں صف اول کے شاعر شمار کئے جانے لگے۔ مخدوم محی الدین کی سیاسی نظمیں جو دلوں کو گرمانے والی ہیں بہت

سے لوگوں کو یاد ہیں۔ خاص طور پر چاند تاروں کا بن، تلنگانہ، چارہ گر جیسی نظموں نے کافی شہرت حاصل کی۔ مخدوم صاحب جامعہ عثمانیہ سے ایم اے کرنے کے بعد سٹی کالج میں اردو کے استاد مقرر ہوئے۔ پھر انہوں نے کمیونسٹ پارٹی کے لیے ملازمت چھوڑ دی اور رات دن پارٹی کے کاموں میں مصروف رہنے لگے۔ اس کے باوجود انہوں نے اُن دنوں اپنی شاعری کے بے شمار جوہر دکھائے۔ مخدوم محی الدین صاحب بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں لیکن انہوں نے بعض دلکش اور اثر انگیز غزلیں بھی کہیں ہیں۔ حیدرآباد کے بہت سے مشاعروں میں میں نے مخدوم صاحب کو سنا ہے اُن کے ساتھ کلام پڑھا ہے۔ مخدوم صاحب سحر انگیز ترنم میں کلام سناتے تھے۔ اردو شاعری کی تاریخ میں مخدوم محی الدین صاحب شاید اکیلے شاعر ہیں جو آزاد نظمیں ترنم میں سنایا کرتے تھے اور جب کسی مظلوم کی آواز ان کے اشعار سے ابھرتی تو سامعین کی پلکیں بھیگ جاتی تھیں۔ مخدوم صاحب مشاعروں میں ہمیشہ جشن تلنگانہ کے دولہے رہتے تھے میں نے بہت قریب سے دیکھا ہے کہ مخدوم صاحب جب کلام سناتے تو آنکھیں بند کر لیتے تھے اور ایک خاص کیفیت اُن پر طاری ہوتی تھی۔ مخدوم صاحب اتنے بڑے شاعر ہونے کے باوجود نہایت سادہ طبیعت انسان تھے۔ اپنے ہم عصر شاعروں سے ہمیشہ دوستانہ فضا میں گفتگو کرتے اور دوستانہ فضا میں ہی ان کے ساتھ رہتے۔ میں نے مخدوم صاحب کو ماہنامہ صبا کے دفتر (مجلس کوارٹرس معظم جاہی مارکٹ) پر بھی دیکھا ہے جہاں وہ کبھی کبھی سلیمان اریب شاہد صدیقی اور دیگر شاعروں کے ساتھ بیٹھا کرتے تھے۔ کمرہ نمبر ۷ صبا کا دفتر تھا۔ سلیمان اریب نے صبا کے ایڈیٹر کی حیثیت سے نہ صرف شعروادب کی

خدمت کی ہے بلکہ اپنے ہم عصر شاعروں میں خوشگوار ماحول کو پروان چڑھایا۔ مخدوم صاحب اپنے لطائف سے محفل کو زعفران زار بناتے تھے میں نے مخدوم صاحب کو اورینٹ ہوٹل میں بھی دیکھا ہے ہمیشہ خوش طبعی اور خوش سلیقگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے شاعر دوستوں، کمیونسٹ پارٹی کے قائدین اور ارکان کے ساتھ بیٹھے رہتے تھے۔ مخدوم صاحب سے میں اپنی ابتدائی شاعری کے زمانے میں شخصی طور پر واقف نہیں تھا لیکن مشاعروں میں ان کے کلام سے محظوظ ہوتا تھا مشاعروں ہی کی وساطت سے میں ان کے قریب ہوتا گیا۔ مخدوم صاحب مشاعروں میں آتے تو ان کے خیر مقدم کے لیے سامعین زوردار تالیوں سے ان کا استقبال کرتے تھے بھرپور داد دیتے تھے بلند مرتبت شاعر، اعلیٰ درجہ کے انسان اور باشعور قائد تھے تقریباً ۴۰ برس پہلے کی بات ہے کہ اردو ہال میں مخدوم محی الدین صاحب کی غزل کا ایک مصرعہ طرح کے طور پر دیا گیا تھا ؎

زندگی موتیوں کی ڈھلکتی لڑی ـــــ زندگی درد و غم کا بیاں دوستو

حیدرآباد کے تقریباً نمائندہ سینیر و جونیر شاعروں نے شرکت کی تھی وہ ایک تاریخی مشاعرہ تھا اُس مشاعرہ میں میں نے بھی اپنا کلام سنایا تھا اُس مشاعرہ کے داعی شمس الدین تاباں اور امین احمد تاب تھے اس مشاعرہ کے بعد ہی ادبی ٹرسٹ کے مشاعروں کی بنیاد پڑی۔ اردو ہال کے تمام بڑے مشاعروں میں مخدوم صاحب کو میں سنتا رہا ہوں۔ مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ ۱۹۶۵ء میں میرے پہلے مجموعہ کلام گلِ تازہ کی رسم اجرا کی تقریب میں

جو اردو ہال میں منعقد ہوئی تھی مخدوم صاحب بھی تشریف لائے تھے مجھے یہ بھی یاد آرہا ہے کہ وہ کسی بھی محفل میں کہیں بھی بیٹھ جاتے تھے۔ گلِ تازہ کی رسم اجراء انجام دینے پروفیسر ڈاکٹر عبدالواحد نے کہا تھا کہ مخدوم محی الدین کی گلِ تر کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے لیکن گلِ تازہ کی معنویت بھی اپنا وجود رکھتی ہے۔ اس ادبی تقریب میں شہر کے تقریباً تمام مشاہیر اردو موجود تھے اردو ہال اپنی تنگ دامنی کا شکوہ کررہا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ مخدوم صاحب نے ایک نہایت ہی جوئیر شاعر گلِ تازہ کو مبارکباد دی تھی۔ مخدوم صاحب کے ہمراہ مجھے بھی کئی کل ہند مشاعروں میں شرکت کرنے کا موقع ملا تھا۔ وہ بمبئی کا۔۔۔ سُرسنگار کا مشاعرہ تھا جس میں اُس دور کے تمام صفِ اول کے شاعر مدعو تھے فلمی دنیا کی تابندہ شخصیت پرتھوی راج کپور نے بھی مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی تھی اس مشاعرے کے بعد دوسرے ہی دن ذریعہ ہوائی جہاز ہم حیدرآباد آیا تھا جناب عابد علی خان صاحب نے ہوائی جہاز کے ٹکٹ کا انتظام کیا تھا حیدرآباد میں جشنِ غالب کے مشاعرہ میں فیض احمد فیض مجروح سلطانپوری کے ہمراہ مجھے بھی آنا تھا۔ عابد علی خان صاحب نے خواجہ عبدالغفور آئی اے ایس سے فون پر کہا تھا کہ فیض اور مجروح کے ہمراہ صلاح الدین نیر کو بھی حیدرآباد بھیج دو۔ ہم حیدرآباد اس وقت پہونچے جب مشاعرہ کی کارروائی کا آغاز ہوچکا تھا مشاعرہ میں ساحر لدھیانوی بھی موجود تھے۔

۳۰ برس پہلے رئیس اختر صاحب انجمن دیارِ ادب کے زیرِ اہتمام بیدر میں مشاعرے منعقد کیا کرتے تھے ایک مشاعرہ میں مخدوم محی الدین صاحب بھی مدعو تھے مخدوم محی الدین صاحب نیر حسن صاحب، رئیس اختر اور میں نے ذریعہ کار بیدر کا

سفر کیا تھا مخدوم صاحب نے دورانِ سفر کئی لطیفے سنائے ۔ کوئی خاص لطیفہ یا کوئی خاص بات ہو تو مخدوم صاحب مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھاتے تھے ان کا مسکراتا چہرہ آنکھوں میں پھر تا رہتا ہے اردو ہندی کے شاعر جیون لال کپڑے کے ایک تاجر تھے پرانے شہر میں اُن کے مکان پر ایک انجمن بزم جیون کے نام سے قائم تھی جس کے تحت ہر ماہ مشاعرہ ہوا کرتا تھا میں تقریباً دو سال بزم جیون کا معتمد رہا ۔ مجھ سے پہلے روحی قادری صاحب معتمد مشاعرہ تھے یہ ۱۹۵۹ء ۱۹۶۲ء کی بات ہے میں نے اپنی معتمدی کے زمانے میں مخدوم صاحب کو بزم جیون کے ایک مشاعرہ کی صدارت کے لئے مدعو کیا تھا وہ بہ خوشی تشریف لائے ۔ مخدوم صاحب کی شرکت نے مجھے سرخروئی کا موقع عطا کیا ۱۹۶۱ء کی بات ہے حیدرآباد ایوننگ کالج میں بین کلیاتی مشاعرہ تھا اُن دنوں میں اورینٹل اُردو کالج کا صدر تھا مشاعرہ میں بھی مدعو تھا ایوننگ کالج کے صدر بزم نے مجھ سے خواہش کی تھی کہ میں مخدوم صاحب کو مشاعرہ کی صدارت کے لئے مدعو کروں ۔ ہم دونوں مخدوم صاحب کی رہائش گاہ واقع قدیم ایم ایلیز کوارٹرس پہونچ گئے ۔ مخدوم صاحب نے مجھے دیکھتے ہی فرمایا تم کالج کے مشاعروں کے گتہ دار بھی ہو ۔ میں ضرور آؤں گا ۔ میں نے مخدوم صاحب سے کہا تھا کہ اس طالب علم کو آپ سے ملنے میں تکلف تھا اور انھیں یہ ڈر تھا کہ آپ ان سے ملیں گے بھی کہ نہیں اور پھر مشاعرے میں ایک بڑے شاعر کو مدعو کرنا اُن کے لئے ایک تجربہ تھا ۔ اس لئے انھوں نے میرا سہارا لیا ہے

ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ میرے ایک ساتھی کا تبادلہ کسی ضلع پر ہوگیا تھا

متعلقہ کمشنر مخدوم صاحب کے دوست تھے شاعر دوست نے مجھ سے کہا کہ صرف مخدوم صاحب ہی یہ کام کر سکتے ہیں۔ اصغر حسین کمشنر اُن کے دوست ہیں۔ ہم دونوں ایک دن صبح مخدوم صاحب سے ملنے کے لئے اُن کی رہائش گاہ قدیم ایم ایل ایز کوارٹر پہونچے۔ مخدوم صاحب نے ڈرائینگ روم میں بیٹھنے کے لئے کہا۔ ۵۔۶ منٹ کے بعد تشریف لائے۔ میں نے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا تو وہ برہم ہو گئے اور کہنے لگے سرکاری ملازم کو جہاں بھجوایا جائے جانا چاہیئے۔ میں نے کہا انہیں جانے میں کوئی تامل نہیں ہے لیکن یہ شاعر بھی ہیں اس لئے حیدرآباد سے باہر جانا نہیں چاہتے۔ اس جملہ پر وہ اور برہم ہو گئے اور کہنے لگے اگر شاعری کرتے ہیں تو کوئی نمبر نہیں مارتے۔ میں کوئی مدد نہیں کر سکتا یہ کہتے ہوئے وہ اپنے کمرہ میں چلے گئے اور وہاں سے انہوں نے کمشنر صاحب کو فون کیا۔ ایک ہفتہ کے بعد تبادلہ منسوخ ہو گیا۔ جانے ایسے کتنے اہل غرض ہوں گے جو اُن سے استفادہ کرتے رہے ہوں گے

ایک دفعہ میں شام میں مدینہ ہوٹل کے روبرو واقع ایک شاعر (سید احمد صاحب) کے مکان کے سامنے تخت پر اپنے شاعر دوستوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا مخدوم صاحب کو معلوم تھا کہ یہاں اوج یعقوبی اور دیگر شاعر بیٹھا کرتے ہیں پتہ نہیں کس سلسلے میں وہ پرانا شہر تشریف لائے تھے جیسے ہی وہ ہمارے قریب آئے ہم سب ان کے احترام میں کھڑے ہو گئے اور انہیں ہم نے سلام کیا۔ سلام کا جواب دیتے ہوئے مخدوم صاحب نے مجھ سے مصافحہ کیا تھا جب یہ بات یاد آتی ہے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ میری ہتھیلی اب بھی گرم ہے بڑی گرم جوشی

کے ساتھ مخدوم صاحب نے مصافحہ کیا تھا کچھ دیر تخت پر بیٹھے رہے اور چلے گئے مخدوم صاحب ادبی ٹرسٹ کے ٹرسٹی تھے عابد علی خان صاحب اور جگر صاحب سے ان کے گہرے مراسم تھے میں نے دیکھا اور محسوس کیا ہے کہ عابد علی خان صاحب اور جگر صاحب مخدوم محی الدین صاحب کی بہت عزت کرتے تھے جب کبھی وہ دفتر سیاست آتے جگر صاحب اُن کے خیر مقدم کے لئے آگے بڑھتے اور انہیں عابد علی خان صاحب کے اجلاس پر لے جاتے تھے تازہ کلام ہو تو اشاعت کے لئے لے لیتے۔ مخدوم صاحب کا ہر تازہ کلام سیاست میں شائع ہوتا تھا۔
ادبی ٹرسٹ نے ان کا مجموعۂ کلام بساطِ رقص شائع کیا جب میں نیا نیا شاعر تھا میرے بعض ساتھی کہتے تھے کہ مخدوم محی الدین صاحب دہریے ہیں خدا کو نہیں مانتے۔ مذہب بیزار ہیں (لیکن یہ غلط ہے) مجھے یاد ہے کہ شاہد صدیقی کی نمازِ جنازہ میں وہ شریک تھے شاہد صدیقی کی نمازِ جنازہ مسجد حالانکہ معظم جاہی مارکیٹ واقع معظم جاہی مارکیٹ میں ہوئی تھی مخدوم صاحب سماج کی نظروں میں ایک پکے کمیونسٹ ضرور تھے لیکن وہ دینِ اسلام سے بہت قریب تھے مذاہب اسلام کی تعظیم میں ہمیشہ سر جھکاتے تھے مخدوم صاحب بہترین قاری تھے۔
کہا جاتا ہے کہ وہ کلامِ پاک مخصوص لحن میں پڑھتے تھے ان کا بچپن دینی ماحول میں گذرا۔
فائن آرٹس اکیڈمی کے فنکار مخدوم محی الدین صاحب کا کلام مختلف مواقع پر ساز پر پیش کیا۔ خاص طور پر نظم چارہ گر (ایک چنبیلی کے منڈوے تلے) ہک لہک کر سنایا کرتے تھے دلکش راؤ کی درد بھری آواز ایک سماں باندھ

دیتی تھی فائن آرٹس اکیڈیمی کے روح رواں حمایت اللہ کی یہ کوشش رہتی ہے کہ موسیقی کے ہر پروگرام میں مخدوم محی الدین صاحب کا کلام ساز پر پیش کیا جائے۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ جب مخدوم محی الدین صاحب جیل سے رہا ہو گئے تو ہزاروں ان کے چاہنے والوں نے ان کا استقبال کیا تھا مخدوم صاحب نہ صرف ایک قائد کی حیثیت سے بے حد مشہور تھے بلکہ ایک عظیم المرتبت شاعر کی حیثیت سے بھی بے حد مقبول تھے مخدوم محی الدین صاحب نے کئی کل ہند مشاعرے پڑھے ہیں مخدوم محی الدین صاحب کا نام ترقی پسند شاعروں کی اولین فہرست میں نمایاں ہے جب آندھرا پردیش کی حکومت میں ایم ایل سی نامزد ہوئے تو اردو کاز کے لئے بھرپور نمائندگی کرتے رہے انجمن ترقی اردو سے گہری وابستگی تھی مخدوم صاحب نہایت سیدھے سادے پُر وقار اور معتبر انسان تھے مخدوم صاحب کو نہ تو مظلوم عوام بھلا سکتے ہیں اور نہ ہی شعر و ادب کی دنیا ہی انہیں بھلا سکتی ہے خاص طور پر حیدرآباد کے دانشورانِ شعر و ادب مخدوم صاحب کو ہر دور میں خراج پیش کرتے رہیں گے حیدرآباد نے بڑے بڑے شاعروں کو جنم دیا ہے لیکن کچھ شاعر ہی ایسے ہوتے ہیں جو عوام اور ادبی حلقوں میں زیادہ مقبول ہوتے ہیں ایسے شاعروں میں سر فہرست ایک نام مخدوم محی الدین کا بھی ہے میرے لئے یہ بات باعث توقیر ہے کہ میں نے مخدوم صاحب کو دیکھا ہے انہیں سنا ہے اور ان کے ساتھ کلام سنایا ہے ایسا اعزاز ایک جونیئر شاعر کے لئے بہت بڑی بات ہے میں اور مجھ جیسے شاعر جو مخدوم صاحب جیسے شاعروں کے سایۂ عاطفت میں شعر و سخن کی محفلوں میں شرکت کرتے رہے ہیں ہمیشہ ان کی یاد کو تازہ رکھیں گے۔

شاہد صدیقی

(قد آور شاعر۔ منفرد طنز نگار)

میں ۱۹۵۹ء میں اورینٹل اُردو کالج کا طالب علم تھا بزم اُردو، اورینٹل اُردو کالج کا بلا مقابلہ صدر منتخب کیا گیا تھا اُردو کالج کی طالب علمی کے زمانے ہی میں کالج کی بزم اردو کی سرگرمیوں کو فروغ دینے کے لئے سرگرداں رہتا تھا بزمِ اُردو کے زیر اہتمام بین کلیاتی ادبی، شعری و تہذیبی مقابلے ہوا کرتے تھے۔ اسی زمانے (۱۹۵۹ء) میں بین کلیاتی اُردو فیسٹول ہونے والا تھا مجھے سرپرستِ اُردو فیسٹول پروفیسر عبدالقادر سروری صدر شعبۂ اُردو جامعہ عثمانیہ نے بہ اتفاق آراء بین کلیاتی اُردو فیسٹول کے کل ہند مشاعرہ کا معتمد مقرر کیا تھا۔ ایک دن اپنے کالج کی بزم اُردو کے جلسے کی نیوز لے کر سیاست پہونچا۔ جناب عابد علی خان صاحب اور جناب محبوب حسین جگر صاحب موجود تھے۔ شاہد صدیقی صاحب ایک علحدہ کمرہ میں مصروفِ کار تھے سیاست کا ابتدائی آفس موجودہ عمارت کے متصل ایک چھوٹی سی عمارت میں تھا جہاں ان دنوں مینیجنگ ایڈیٹر سیاست جناب

ظہیر الدین علی خان کا اجلاس ہے (جہاں پہلے جناب عابد علی خان تشریف فرما رہتے تھے) جگر صاحب نے نیوز دیکھ کر فرمایا تھا کہ نیوز چھپ جائے گی پتہ نہیں جگر صاحب کو میری کونسی ادا پسند آ گئی۔ انہوں نے شاہد صدیقی صاحب سے کہا کہ یہ صلاح الدین نیر ہیں۔ بزم اردو اور نیشنل اردو کالج کے صدر ہیں کالج کی نیوز لے کر آئے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ انہیں محفل شعر کے کالم کی ذمہ داری سونپیوں (اُس وقت شاہد صدیقی صاحب محفل شعر کا کالم ترتیب دیتے تھے) یہ شاہد صدیقی صاحب سے میری پہلی ملاقات تھی۔ شاہد صدیقی صاحب کو میں نے شہر کے بہت سے مشاعروں میں دیکھا تھا۔ ان کا کلام سنا تھا۔ مبتدی شاعر کی حیثیت سے میں نے ان کے ساتھ کئی مشاعرے پڑھے ہیں۔ شاہد صاحب سے میری کوئی رسم و راہ نہیں تھی۔ مجھے یاد ہے کہ وہ ترنم میں غزلیں سناتے تھے۔ اُن کا کلام مجھے بے حد پسند تھا۔ وہ ہر سال صنعتی نمائش کے دوران ہونے والے نمائش کلب کے مشاعرہ کے معتمد رہتے تھے۔ اُن دنوں نمائش کلب کا مشاعرہ پڑھنا بہت بڑی بات تھی شہر کے اہم منتخب شاعر مدعو رہتے تھے مجھ جیسے جونیر شاعر کے لئے تو بے حد عزت کی بات تھی یہ بات ۲۵ برس پہلے کی ہے شاہد صاحب نے ایک دو سطری تحریر کے ذریعہ مجھ سے نمائش کلب کے مشاعرہ میں کلام سنانے کی دعوت دی تھی۔ شاہد صاحب نے معتمد مشاعرہ کی حیثیت سے مجھے مدعو کیا تھا۔ نمائش سوسائٹی کی جانب سے مشاعرہ کے آغاز سے پہلے نہایت پرتکلف عشائیہ دیا جاتا تھا۔ ایک دفعہ کی بات ہے کہ میں مدینہ ہوٹل

میں چائے پی کر پان کھانے کے لئے مدینہ ہوٹل کے روبرو واقع پان کی دوکان پہونچا جو حمیدی کنفکیشنری سے متصل تھی وہاں جب میں نے شاہد صدیقی صاحب کو پان لیتے ہوئے دیکھا تو احتراماً پان کے پیسے دینے کی کوشش کی۔ شاہد صاحب نے کہا تم مجھ سے چھوٹے ہو یہ تمہارا کام نہیں ہے شاہد صاحب نے میرے پان کے پیسے خود دیئے۔ اس پان کی دوکان سے نامور شاعر خورشید احمد جامی بھی پان لیا کرتے تھے شاہد صاحب مشاعروں میں غزلیں سناتے تھے اور خوب جم کر سناتے تھے اپنے دور کے کامیاب ترین شاعر تھے اردو ہال کے ایک مشاعرہ میں انہوں نے ایک نظم "شاعر" تحت میں سنائی تھی۔ پہلی دفعہ میں نے انہیں تحت میں کلام سناتے ہوئے دیکھا تھا ویسے زندگی کے آخری دنوں میں وہ تحت اللفظ ہی میں کلام سناتے تھے انہوں نے یہ شعر سنا کر ساری محفل کو تہہ و بالا کر دیا تھا۔

پرستش اُن کی ہوتی ہے جو بُت میں نے تراشے ہیں
مگر مجھ کو کمالِ بُت گری سے کچھ نہیں ملتا

اس شعر کا صحیح اور برموقت استعمال جناب نریندر لوتھر صاحب نے اُتر پردیش اُردو اکیڈیمی کے انعام یافتہ گان کے تہنیتی جلسہ میں جو ہنری مارٹن انسٹیٹیوٹ میں ہوا تھا کیا تھا (انعام یافتہ گان میں میں بھی شامل تھا میں نے بھی مخاطب کیا تھا) اس شعر کے بارے میں مجھ سے دریافت کیا تو میں نے کہا تھا کہ یہ شعر شاہد صدیقی صاحب کا ہے۔ ماہنامہ صبا کی امداد کے لئے ایک کل ہند مشاعرہ رام کوٹ (سلطان بازار) میں ہوا تھا۔ اس مشاعرہ میں ملک کی تقسیم

کے بعد شاید پہلی دفعہ پاکستان کے کرکٹ کے کھلاڑیوں کی ٹیم حیدرآباد آئی تھی۔ اُس ٹیم کے کھلاڑیوں نے بھی اس مشاعرہ میں شرکت کی تھی مشاعرہ میں جوش اور مجروح صاحب بھی مدعو تھے ملک کے دیگر نامور ترقی پسند شعراء بھی تشریف لائے تھے میں نے بھی اُس مشاعرہ میں اپنا کلام سنایا تھا میں شاہد صاحب کے بازو شہ نشین پر بیٹھا ہوا تھا شاہد صاحب کے ساتھ مجروح صاحب بھی تھے جوش صاحب کلام سُنا رہے تھے جوش صاحب کو مشاعرہ میں خاطر خواہ داد نہیں مل رہی تھی انہوں نے مجروح صاحب اور شاہد صاحب کو جو ان کے پاس ہی بیٹھے ہوئے تھے پلٹ کر کہا کہ "المائے مردود! مصرعے اٹھاؤ" شاہد صاحب نے برجستہ کہا "مجروح صاحب جوش صاحب آپ سے کچھ کہہ رہے ہیں" شاہد صاحب نہایت بذلہ سنج اور محفل کے آدمی تھے۔ اُس مشاعرہ کے معتمدِ مشاعرہ اختر حسن صاحب تھے جوش صاحب نے اپنی مشہور نظم "ہائے رے جوانی ہائے رے تیرا ملانے" سنائی تھی۔ اس نظم سے مشاعرہ کی فضاء بگڑ گئی۔ خواتین محفل سے اُٹھ کر جانے لگیں مشاعرہ درہم برہم ہوا۔ جناب اختر حسن نے مشاعرے کی برخواستگی کا اعلان کیا۔ شاہد صاحب "سیاست" میں شیشہ و تیشہ کا کالم لکھتے تھے بہت ہی کامیاب کالم نگار رہے ہیں شیشہ و تیشہ کی تحریروں اور شاعری پر مشتمل شیشہ و تیشہ کے نام سے کتاب شائع ہوئی ہے جس کو جناب مجتبیٰ حسین نے مرتب کیا ہے۔ مجھے شاہد صاحب کے ساتھ اضلاع کے مشاعروں میں بھی شرکت کرنے کا موقع ملا ہے بلکہ میں آمی کاریاد بات میں بھی سفر کرتا جس میں

شاہد صاحب بھی رہتے۔ شاہد صاحب بلا نوش تھے ابن احمد تاب بھی
شاہد صاحب سے کم نہیں تھے۔ انجمن ترقی اردو کریم نگر کے سالانہ جلسے
اور مشاعرہ میں کنول پرشاد کنول، شاہد صدیقی، سلیمان اریب، ابن
احمد تاب، خیرات ندیم اور دیگر شاعروں کے علاوہ میں بھی مدعو تھا
راستہ میں جائے خانے تو ملتے رہے لیکن کوئی سیندھی خانہ نہیں ملا۔
ایک مقام پر شاہد صاحب نے کار رکوائی اور کہا کہ ہم ابھی آتے ہیں۔
ابن احمد تاب بھی ان کے ساتھ ہو گئے۔ کچھ دیر بعد وہ آئے تو نشہ میں
دھت تھے انہوں نے ایک جھونپڑی میں سیندھی پی لی تھی۔ موٹر میں سوار
ہوتے ہی ابن احمد تاب اپنی نشست پر بیٹھنے کی بجائے شعراء کے پاؤں
پر سو گئے۔ اس طرح کے واقعات کا بھی میں نے مشاہدہ کیا ہے۔ شاہد
صدیقی صاحب مشاعروں میں شراب پی کر ضرور آتے تھے لیکن انہوں
نے کبھی بھی کوئی مشاعرہ نہیں بگاڑا۔ اُس زمانے میں اہم مشاعروں میں
علامہ حیرت بدایونی، شاہد صدیقی، کنول پرشاد کنول، سلیمان اریب،
منوہر لال بہار، سعید شہیدی، اوج یعقوبی، خیرات ندیم، رحمٰن جامی، تلمیذ
طالب رزاقی، عزیز قیسی، شاذ تمکنت، راشد آذر، ڈاکٹر وحید اختر لازماً شرکت
کرتے تھے جو غیر شاعر ونڈں میں، ناصر کرنولی، رئیس اختر بھی مدعو رہتے تھے
اُس دور کے مشاعروں میں کوئی جدید یہ دکھائی نہیں دیتا تھا اُس دور
میں نمائندہ شاعروں کے لئے اُردو ہال موزوں ترین مقام تھا لیے شمار
مشاعرے اُردو ہال میں ہوتے رہے۔ شاہد صدیقی صاحب کا اور میرا

ساتھ ہی مشاعروں میں رہا ہے آخری بین کلیاتی اردو فیسٹول ۱۹۵۹ء کے کل ہند مشاعرہ میں فراق گورکھپوری، ساحر لدھیانوی، مجروح سلطان پوری، جاں نثار اختر، کیفی اعظمی وغیرہ نے شرکت کی تھی۔ میں اس مشاعرہ کا معتمد تھا اور شاہد صدیقی صدر مشاعرہ تھے ان دنوں شاہد صدیقی صاحب کا کالم شیشہ و تیشہ بے حد مشہور تھا۔ ۶۰-۱۹۵۹ء کے دوران پرانے شہر میں اتحاد الشعراء کے نام سے ایک شعری و ادبی انجمن قائم ہوئی تھی جس کے زیر اہتمام صرف مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ ادارۂ اتحاد الشعراء کے مشاعرے علامہ قدر عریضی کی رہائش گاہ باغ فریدون جاہ میں ہوا کرتے تھے اتحاد الشعراء کے عہدہ داروں کا باضابطہ انتخاب ہوتا تھا۔ علامہ نجم آفندی صدر ادارہ منتخب ہوئے اور میں معتمد ادارہ۔ اس ادارہ سے شہر اور اضلاع کی ۲۱ انجمنوں کا الحاق ہو چکا تھا۔ یہ انجمن خوش اسلوبی کے ساتھ سرگرم رہا کرتی تھی۔ ان دنوں اتحاد الشعراء کے مشاعروں کا کئی دفعہ شاہد صاحب نے شیشہ و تیشہ کے کالم میں مذاق اڑایا۔ شاہد صاحب کا یہ خیال تھا کہ شعراء میں کبھی اتحاد نہیں ہو سکتا اور نہ ہی وہ مقررہ وقت پر مشاعروں میں شرکت کر سکتے ہیں۔ شاہد صاحب کے تضحیک آمیز جملوں سے مجھے تکلیف ہوتی تھی ایک دن میں غصہ کے عالم میں سیاست پہونچا اور جگر صاحب سے مل کر شیشہ و تیشہ کے کالم کے بارے میں اپنی ناراضگی ظاہر کی اور کہا کہ اتحاد الشعراء پرانے شہر کی ایک مرکزی انجمن ہے آپ کے اخبار میں اس انجمن کی سرگرمیوں کا مذاق اڑایا جا رہا ہے یہ کوئی مناسب بات نہیں ہے جگر صاحب نے

مجھے سمجھایا اور کہا کہ "شیشہ و تیشہ" کا کالم ایک طنزیہ کالم ہے تم اس بات کا اثر مت لو۔ دراصل میں جگر صاحب سے یہ کہنا چاہتا تھا کہ وہ شاہد صاحب کو سمجھائیں کہ اتحادالشعراء کا مذاق نہ اڑائیں۔ شاہد صدیقی صاحب کو بہت سے لطیفے یاد تھے۔ کئی لطیفے وہ خود تخلیق کرتے تھے۔ سالار جنگ میوزیم میں اردو کتابوں کی فہرست مرتب کرنے کا کام شاہد صاحب کو بھی ملا تھا۔ نصیرالدین ہاشمی صاحب بھی اس کام سے وابستہ تھے شاہد صاحب چونکہ طنز نگار تھے اس لئے وہ نصیرالدین ہاشمی کے بارے میں کچھ نہ کچھ گھڑ لیتے تھے لیکن ان کی شخصیت کا احترام کرتے تھے مشاعروں میں علامہ حیرت بدایونی اور شاہد صدیقی صاحب کی نوک جھونک چلتی رہتی تھی۔ علامہ حیرت شراب نوشی کے سخت خلاف تھے لیکن اس دور کے تقریباً تمام شعراء کی جام و مینا سے دوستی تھی۔ اس دور میں بھرپور مشاعرے ہوتے تھے ماہنامہ صبا کا دفتر نئے اور پرانے شعراء کے لئے مرکزیت کی حیثیت رکھتا تھا۔ شاہد صدیقی صاحب عموماً شام میں صبا کے آفس میں پائے جاتے تھے سلیمان اریب صاحب نے صبا کے ذریعہ شعر و ادب کی بڑی خدمت کی ہے اس دور کے ملک بھر کے نامور شاعروں و ادیبوں کی تخلیقات صبا میں شائع ہوتی تھیں۔ اریب صاحب نے صبا کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی تھی۔ صبا بہت ہی معیاری رسالہ تھا حیدرآباد کے بیشتر ادیبوں اور شاعروں نے اس رسالے کے ذریعہ اپنی پہچان بنائی شاہد صدیقی صاحب نے شہر کے بہت سے اخباروں میں کام کیا لیکن ان

رشتہ اخبار سیاست سے اٹوٹ رہا۔ کئی برسوں تک سیاست سے وابستہ رہے۔ زندگی کے آخری لمحوں تک ان کی وابستگی رہی۔ شاہد صدیقی کی عابد علی خان اور جگر صاحب بہت قدر کرتے تھے۔ شاہد صاحب کی صلاحیتوں کو دل وجان سے سراہتے تھے ــــــ دماغ کی شریانیں پھٹ جانے سے شاہد صاحب کا انتقال ہوا۔ شاہد صاحب لاولد تھے ان کی آخری آرام گاہ مخدوم محی الدین صاحب کی قبر سے متصل احاطہ درگاہ حضرت شاہ خاموشؒ میں واقع ہے۔ شاہد صدیقی نہایت مخلص، صاف گو انسان تھے اعلیٰ درجے کے شاعر تھے ان کا ایک ہی مختصر سا مجموعۂ کلام چراغِ منزل ہے جس کو انجمن ترقی اردو آندھراپردیش نے شائع کیا ہے مخدوم محی الدین ان کے خاص دوستوں میں سے تھے بیسیوں مشاعرے شاہد صاحب اُن کے ساتھ پڑھے۔ جب کبھی جگر مرادآبادی حیدرآباد آتے شاہد صدیقی صاحب کا زیادہ وقت اُن کے ساتھ گذرتا تھا دونوں کو رمی کھیلنے کا بہت شوق تھا۔ شاہد صاحب جگر مرادآبادی کی بہت قدر کرتے تھے میری ہمیشہ حوصلہ افزائی فرماتے رہے۔ کئی مشاعروں میں مجھے مدعو کیا۔ سنہ ۱۹۶۰ء میں نظام کلب میں دو دن مشاعرے ہوئے تھے سنجیدہ مشاعرہ احاطہ نظام کلب میں ہوا تھا شاہد صدیقی صاحب صدرِ مشاعرہ تھے اور میں معتمدِ مشاعرہ۔ دوسرے دن کلب کے ہال میں مشاعرہ ہوا تھا اس مشاعرہ کی صدارت بھی شاہد صاحب نے ہی کی تھی۔ میں معتمد مشاعرہ تھا۔ مشاعرے کے سارے انتظامات جناب عابد علی خان اور جگر صاحب کی مشاورت سے طے پائے

تھے جگر صاحب نے ہی مجھے دونوں مشاعروں کا معتمدِ مشاعرہ نامزد کیا تھا
مجھے ایک اور مشاعرہ یاد آرہا ہے ۔ ۳۶ یا ۳۷ برس پہلے کی بات ہے
محبوب نگر میں بہت بڑے مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا تھا عبدالعزیز عزیز
ایڈیٹر تعمیر اس مشاعرہ کے کنوینر تھے اس مشاعرہ میں حیدرآباد
کے شعراء دو وبان کے ذریعہ مشاعرہ گاہ پہنچے جب مشاعرہ گاہ پہنچے تو کافی
دیر ہوگئی تھی وہاں سامعین کا ہجوم ہی نہیں تھا عزیز صاحب بھی موجود نہیں
تھے پھر شعراء کی آمد کی تشہیر کی گئی رات دیر گئے مشاعرہ منعقد ہوا ۔ اُس
زمانے میں غلام دستگیر قریشی محبوب نگر کے کلکٹر تھے انھوں نے دوسرے
دن تمام شاعروں کو سرکاری موٹروں میں حیدرآباد بھیجوایا ۔ اُس کل ہند
مشاعرہ میں حسرت جےپوری اور مینا قاضی نے بھی شرکت کی تھی مشاعرہ
میں تاخیر سے پہنچنے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ راستے میں وبان کے پہیوں
سے چنگاریاں نکلنے لگی تھیں ۔ وبان درست کرنے کے لئے کافی وقت لگا
تھا شاعرات میں ڈاکٹر اشرف رفیع اور اُن کی بہن زبیدہ رعنا بھی مدعو
تھیں ۔ ۴۴ برس پہلے اسٹینلی گرلز اسکول میں ایک عظیم الشان کل ہند
مشاعرہ ہوا تھا یہ اُن دنوں کی بات ہے جب میں شعر و ادب کی محفلوں
سے زیادہ مانوس نہیں تھا مجھے شعر سننے کا بہت شوق تھا میں شہ نشین
کے قریب ہی بیٹھا رہا ۔ اس مشاعرہ میں شاہد صدیقی بھی موجود تھے مشاعرہ
میں کسی بات پر سکندر علی وجد اور شاہد صدیقی میں تکرار ہوئی تھی ۔ اُس
مشاعرہ میں پاکستان کی ایک شاعرہ سحاب قزلباش بھی موجود تھیں ۔

کسی شاعر نے ان کے ساتھ کچھ چھیڑ چھاڑ کی تھی جس پر وہ برہم ہو کر مشاعرہ سر پر اٹھا لیا تھا مشاعرہ بگڑتے بگڑتے رہ گیا جوش صاحب نے اپنی مشہور نظم ہائے جوانی ہائے زمانے سنا کر مشاعرہ کو آسمان پر پہونچا یا تھا حیدرآباد کی ایک طوائف جس کا مکان محبوب کی مہندی کے مخصوص علاقے سے ذرا ہٹ کر تھا شاہد صاحب کی دوست تھی۔ شاہد صاحب سے اس کے بے حد قربی مراسم تھے شاہد صاحب اکثر اس طوائف کے پاس جاتے تھے پرنس معظم جاہ شجیع کے دربار شاعری سے بھی شاہد صدیقی کو بھرپور واسطہ رہا ہے۔ کئی راتیں شاہد صاحب کی پرنس معظم جاہ شجیع کے دربار شاعری کی نذر ہو گئیں۔ پرنس معظم جاہ شجیع کے محفل میں رات رات بھر جاگ کر ان کی صحت جواب دے چکی تھی زندگی کے آخری دنوں میں پرنس کے پاس وہ بہت کم جاتے تھے۔ اس دربار شاعری سے جوش، فانی، خمار کے علاوہ حیدرآباد کے شاعروں میں اوج یعقوبی اور خواجہ شوق وابستہ رہے ہیں۔ شاہد صدیقی کو میں اس لئے بھی نہیں بھول سکتا کہ میری ابتدائی شاعری کے زمانے میں انہوں نے مشاعرہ میں میری سرپرستی کی تھی۔ اکثر مشاعروں کے انعقاد میں ان کا دخل رہتا تھا۔ مجھے مدعو کیا کرتے تھے۔ نمائش کلب کے مشاعروں میں ہر سال مدعو کرتے تھے۔ شاہد صاحب کے انتقال کے بعد علامہ حیرت بدایونی نمائش کلب کے مشاعروں کی معتمدی کے لئے منتخب کئے گئے تھے علامہ کے بعد سے میں معتمد مشاعرہ کی ذمہ داری نبھا رہا ہوں گذشتہ ۲۵ برس سے یعنی علامہ کے انتقال

کے بعد سے بلا وقفہ میں معتمدِ مشاعرہ کے فرائض انجام دے رہا ہوں۔ نمائش کلب کے اربابِ مجاز کے علاوہ میرے کرم فرما سیاست کے سینیئر صحافی جناب ہاشم سعید صاحب کی شخصی دلچسپی کی وجہ سے بھی میں معتمد مشاعرہ کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دے رہا ہوں۔ جناب احمد حسین صاحب اور خاص طور پر محی الدین جیلانی صاحب کو میری ذات سے خاصی دلچسپی ہے شہر کے بہت سے شاعروں کو شاہد صاحب کی شاعرانہ سرپرستی حاصل تھی ممتاز شاعر رئیس اختر بھی اُن میں شامل ہیں۔ شاہد صدیقی کی میرے دل میں بے حد قدر و منزلت تھی ہمیشہ میں اُن کا نام احترام کے ساتھ لیتا ہوں۔

علامہ قدر عریضی

عالی قدر، ماہرِ علم عروض، معتبر استادِ سخن

مجھے یہ نہیں معلوم کہ میرے استاد علامہ قدر عریضی صاحب کو کس محترم استادِ سخن سے شرفِ تلمذ حاصل تھا لیکن یہ روایت رہی ہے کہ ہر شاعر کا کوئی نہ کوئی استاد رہتا ہے بہت کم ایسے شاعر ہوں گے جنھوں نے اپنے کلام پر کسی سے بھی اصلاح نہ لی ہو۔ حضرت قدر عریضی کے ہم عصر شاعروں میں علامہ نجم آفندی، مولانا کامل شطاری، حضرت تاج قریشی حیدر پاشاہ، سیف خموی، احمد علی شاب، مولانا معز ملتانی اور ادج یعقوبی جیسے جید استاد شاعر تھے۔ علامہ قدر عریضی غزلیں بھی کہتے تھے رباعیات بھی، نعتیں بھی، منقبتیں اور سلام بھی۔ فارسی میں بھی شعر کہتے تھے قدر صاحب بہت ہی گرجدار پُر جوش ترنم میں کلام سناتے تھے قدر صاحب اپنے شاگردوں کے کلام پر فی الفور اصلاح دیتے تھے قدر صاحب کے شاگردوں کی کثیر تعداد ہے مشہور شاعر قمر ساحری (پاکستان) بھی قدر صاحب کے

شاگرد رہے ہیں مجھے بھی قدر صاحب کا شاگرد رہنے کا اعزاز حاصل ہے
میری شاعری کے ابتدائی زمانے میں شہر کی کئی انجمنوں کے زیر اہتمام طرحی و
غیر طرحی مشاعرے ہوتے تھے قدر صاحب اپنے شاگردوں کو
فی البدیہہ شعر کہنے کی مشق کراتے تھے کہتے تھے کہ زیادہ سے زیادہ شعر کہو
لیکن بیاض میں منتخب شعر ہی رہنا چاہیئے۔ مشق کے دوران بہت سے
شعر بھرتی کے ہو جاتے ہیں قافیہ پیمائی ہوتی ہے اچھے شعروں کی تعداد
کم ہی رہتی ہے اکثر اتوار کے دن میں قدر صاحب کے دولت خانہ جایا
کرتا تھا۔ قدر صاحب کا دولت خانہ باغ فریدون جاہ (چیمنی علم) میں
واقع تھا میں قدر صاحب کے ایسے شاگردوں سے بھی واقف ہوں جو صرف
تخلص کے گنہ گار ہیں۔ میں غالباً دس بارہ برس تک قدر صاحب کے تلامذہ
میں شامل رہا۔ قدر صاحب کے شاگردوں نے قدر ادب کے نام سے ایک
انجمن بنائی تھی جس کے زیر اہتمام ہر ماہ پابندی سے مشاعرے ہوا کرتے تھے
ان کے ایک سینئر شاگرد جناب فرید الدین معتمد انجمن تھے قدر ادب کے
زیر اہتمام زیادہ تر طرحی مشاعرے ہوتے تھے شہر کے تقریباً ۳۰، ۳۵ شاعر
مشاعرہ میں شریک رہتے تھے۔ میں نے علامہ نجم آفندی، کامل شطاری، حضرت
تاج قریشی، سیف حموی کو بھی قدر ادب کے مشاعروں میں سنا ہے۔ ایک
اور انجمن اتحاد الشعراء کے نام سے تشکیل پائی تھی جس کے صدر علامہ نجم آفندی
تھے جس کا باضابطہ الکشن ہوتا تھا مجھے معتمد اتحاد الشعراء منتخب کیا گیا
تھا اس انجمن کے تحت نہایت پابندی سے مشاعرے ہوتے تھے قدر صاحب

کی سرپرستی میں بزم سعدی کے نام سے بھی فارسی کی انجمن قائم ہوئی تھی جس کے مشاعرے قدر صاحب کے مکان پر ہوتے تھے قدر صاحب صدر انجمن تھے قمر ساحری معتمد اور میں شریک معتمد تھا اس میں بہت سے شاعر فارسی میں بھی کلام سناتے تھے ڈاکٹر طاہر علی خاں مسلم بھی مشاعرے میں شرکت فرماتے تھے بزم سعدی کئی برس تک کام کرتی رہی۔ قدر صاحب کے تین مجموعۂ کلام شائع ہو چکے ہیں کلام شروع کرنے سے پہلے بحر کے اوزان لکھ دیتے ہیں۔ قدر صاحب کے تین شعری مجموعے شائع ہوئے ہیں اس زمانے میں میں اپنا کلام اوج یعقوبی صاحب کو بھی دکھاتا تھا لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا کہ قدر صاحب کا تصحیح شدہ کلام اوج صاحب کو دکھایا ہو۔ قدر صاحب اُن کے شاگردوں کی سادہ چائے (بغیر دودھ کے) سے تواضع کرتے تھے بہت ہی عمدہ چائے ہوتی تھی اپنے گھر کے مشاعروں میں سادہ چائے سے ہی شعراء و سامعین کی تواضع کرتے تھے صاحب ماہر علم عروض تھے اپنے شاگردوں کو شعر کی تقطیع کرنے کا طریقہ بتایا کرتے تھے لیکن اُس وقت بھی تقطیع کرنے کا رواج بہت کم تھا صرف واقفیت کی حد تک علم عروض کے بارے میں بتلاتے۔ اوج یعقوبی صاحب نے کبھی بھی علم عروض اور شعر کی تقطیع کرنے کی بات نہیں کی۔ ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی۔ مشق کرتے کرتے شاعر خود وزن میں شعر کہتا ہے جو شاعر اساتذۂ سخن سے کلام لکھوالیتے تھے انہیں نہ تو مشقِ سخن کی ضرورت پڑتی ہے اور نہ اچھے بُرے

کلام کی فکر رہتی۔ استاد سے جو کچھ ملا حاصل کرتے۔ مشاعروں میں سناتے
قدر صاحب کا کلام کافی پسند کیا جاتا تھا۔ آدابِ شعر گوئی اور
زبان و بیان کا خاص خیال رکھتے تھے مشاعروں میں بڑے اہتمام سے
شرکت کرتے تھے میں قدر صاحب کی وساطت سے پرانے شہر کے بہت
سے مشاعروں میں مدعو کیا جاتا تھا اشعار اور ترنم دونوں کی پذیرائی
ہوتی تھی جب قدر صاحب حج بیت اللہ شریف کی سعادت حاصل
کر کے ہوٹے تو غزل کہنا چھوڑ دی۔ نعتیں اور منقبتیں کہتے
رہے میں نے محسوس کیا کہ حضرت تاجؔ قریشی ان کے بہت ہی قریبی
دوست ہیں سیف حموی سے بھی ان کے اچھے خاصے مراسم تھے مولانا کامل
شطاری سے ان کے قریبی رشتہ داری تھی مولانا کامل کی رہائش گاہ پر
پابندی سے ہر ماہ ہونے والے مشاعروں میں شریک ہوتے تھے میں
بھی مدعو رہتا تھا اُس زمانے میں علامہ نجم آفندی کے ایک خاص شاگرد
ساجد رضوی تھے جو میرے بہت اچھے دوست تھے بہت اچھے شاعر تھے
بہت ہی عمدہ ترنم میں شعر سناتے تھے اُس دور کے نوجوان شاعروں
میں ان کا کلام کافی پسند کیا جاتا تھا نجم صاحب کے شاگردوں میں
جہاں تک میری معلومات ہیں خاور نوری، ساجد رضوی، ڈاکٹر صادق
رضوی، اشرغوری مشہور شاعر ہیں جو شہر میں ہونے والے چھوٹے مشاعروں
کے علاوہ شہر کے بڑے بڑے مشاعروں میں شرکت کرتے تھے ڈاکٹر
صادق نقوی اور اشرغوری اب بھی شرکت کرتے ہیں مظہر کامل

جد مولانا کامل شطاری کے خاص شاگردوں میں سے تھے پابندی سے قدر ادب اور اتحاد الشعراء کے مشاعروں میں شرکت کرتے تھے مظہر کامل پاکستان چلے گئے۔ قمر ساحری تو بہت پہلے پاکستان چلے گئے قدر صاحب کے ایک شاگرد عارف بیابانی بھی تھے جو نعتیہ و منقبتی مشاعروں کے اہتمام میں بڑی دلچسپی لیتے تھے ان کے پیر میں لنگ تھا اس کے باوجود مشاعرہ میں موجود رہتے تھے یہ حضرت کسی ایک جگہ جم کر نہیں بیٹھتے تھے بعض معاملات میں نمایاں کردار ادا کرتے تھے قدر صاحب کے شاگردوں میں فرید صاحب ایک وفادار شاگرد ہیں قدر صاحب کا بہت خیال رکھتے تھے اکثر اوقات قدر صاحب کے ساتھ مشاعروں میں شرکت کرتے تھے قدر صاحب کا کلام بہت عمدہ پاک وصاف ہوتا تھا۔ مشاعروں میں خوب رنگ جماتے تھے اُس دور میں علامہ نجم آفندی مولانا کامل شطاری، قدر عریضی حضرت تاج قریشی کا بڑا شہرہ تھا یہ چار شاعر ہم پلہ تھے لیکن ہر شاعر کی اپنی ایک انفرادیت تھی نجم آفندی کامل شطاری اور تاج قریشی تحت میں کلام سناتے تھے مگر قدر صاحب ترنم میں سناتے۔ قدر صاحب نے رباعیات کے مشاعروں کی بنیاد ڈالی تھی رباعی کے مشاعرے کئی برس جاری رہے اُس دور میں کئی شاعروں نے رباعی کہنی شروع کی تھی جس طرح بزم سعدی کے قیام کے بعد کئی شاعروں نے فارسی میں کلام کہنا شروع کیا تھا۔ رباعی کے مشاعرے قدر صاحب کے مکان پر ہوتے تھے قدر ادب کی سالانہ تقریب میں ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور اور راجے کشن پرشاد

(آئی اے ایس) نے بھی شرکت کی تھی۔ اُس زمانے میں دعوت نامے ضرور چھپوا
جاتے تھے۔ نوجوان شعراء کو اگر کسی مشاعرہ کا دعوت نامہ ملتا تو وہ
بہت خوش ہوتے تھے۔ علامہ نجم آفندی کے زیر اہتمام چلنے والی انجمن زاویۂ ادب
کے علاوہ مولانا کامل کے زیر اہتمام ہونے والے مشاعروں میں بھی پابندی سے
شرکت کیا کرتے تھے۔ میری ابتدائی شاعری کے زمانے میں مالی والا پیالس
(پنجہ شاہ) میں ایک شاندار مشاعرہ ہوا تھا۔ مہاراج کرن کے والد محترم راجہ محبوب
کرن نے صدارت کی تھی اُس وقت کی ایک یادگار تصویر میرے ہاں موجود ہے
مجھے یاد ہے کہ میں نے اُس مشاعرہ میں یہ غزل سنائی تھی۔

تمھارا ہی لب و لہجہ ہمیں محسوس ہوتا ہے
صلاح الدین نیر جب غزل اپنی سناتے ہیں

وہ طرحی مشاعرہ تھا اس دور کے اساتذہ کا یہ وتیرہ تھا کہ وہ ہونہار
شاگردوں کی برسرِ مشاعرہ ہی حوصلہ افزائی کرتے تھے اور ہر استاد کے دو تین شاگرد
ہمیشہ اُن کے ساتھ رہتے جن پر اساتذۂ سخن فخر محسوس کیا کرتے تھے قدر صاحب ایک
بلند مرتبت شاعر تھے لیکن جب اُن کے کلام پر انھیں داد ملتی تو جھوم جھوم
کر کلام سناتے تھے۔ انتہائی وضع دار شاعر تھے ساری زندگی پاک و صاف بے داغ
آئینوں کی طرح گذاری۔ نام و نمود کی کبھی آرزو نہیں کی۔ اُس دور کے
بڑے مشاعروں میں اساتذۂ سخن کم کم دکھائی دیتے تھے البتہ علامہ
نجم آفندی بعض بڑے مشاعروں میں موجود رہتے تھے ہر شاعر کا کلام سنانے
کا انداز بھی الگ ہوتا تھا نجم صاحب کلام سناتے تو سارے سامعین

متوجہ ہو جاتے۔ اگر کوئی خاص شعر ہو تو کہنے جہاں جہاں حضرات ہیں
اور جہاں جہاں تک میری آواز پہونچ رہی ہے پہنچے۔ شعر پڑھتے وقت ساری
محفل پر نظر رکھتے۔ قدیم مشاعروں کی روایت میں آداب محفل کا بڑا
لحاظ رکھا جاتا تھا جب کبھی کوئی استاد شاعر محفل میں داخل ہوتے تو شہ نشین
کے قریب بیٹھے ہوئے تمام شاعر کھڑے ہو جاتے اور ان کے بیٹھنے کے بعد
ہی بیٹھ جاتے تھے۔ ہر استاد کا شاگرد اپنے استاد کے ہم عصر استاد شاعر
کا انتہائی احترام کرتا تھا۔ میں نے بھی دیکھا ہے کہ اس دور کے اساتذہ کرام
نہایت فراخ دل اور کھلے ذہن کے حامل تھے نوجوان شاعروں کی حوصلہ افزائی
کرتے تھے اچھے اشعار پر داد دیتے تھے جب خود کلام سناتے تو صدر مشاعرہ
کے علاوہ اپنے ہم رتبہ شاعروں کو جو شہ نشین کے قریب رہتے انھیں
بھی مخاطب کرتے ہوئے شعر سناتے تھے جس سے نہایت ہی خوشگوار
فضا بنی رہتی۔ مشاعرہ شروع ہونے سے پہلے شعراء و سامعین کی تواضع
کی جاتی تھی میں نے بعض ایسے باذوق سامعین کو بھی دیکھا ہے جو ہر مشاعرہ
میں موجود رہتے تھے اب مشاعروں کی وہ روایتیں دم توڑ چکی ہیں اب
بھی مشاعرے ہوتے ہیں لیکن وہ بات نہیں رہی بہت کچھ بدل گیا ہے
ہمارے شہر کے اساتذۂ سخن نے اخباروں اور رسالوں میں اپنے
کلام کی اشاعت کے لئے بہت کم توجہ دی جس کی وجہ سے ملک بھر کے ادبی
حلقے بہت سے اساتذۂ سخن کے نام سے ابھی واقف نہیں ہیں۔ البتہ
علامہ نجم آفندی کا نام ادبی رسالوں کی زینت بنا رہتا تھا ادبی حلقے اُن کے نام

سے خوب واقف ہیں۔ مولانا کاملؔ نے اپنے نعتیہ کلام کی وجہ سے شہرت پائی گذشتہ کچھ برسوں سے شہر کی جامعات میں ہمارے اساتذۂ سخن کی شاعری کے اعتراف میں ایم فل کے لئے مقالے لکھے جا رہے ہیں بلکہ لکھے جا چکے ہیں۔ بعض تو ایسے اساتذۂ سخن بھی ہیں جن کا کلام تا حال کتابی شکل میں منظرِ عام پر نہیں آیا۔ جس کی اشاعت پر توجہ کی ضرورت ہے

قدرؔ صاحب جیسے وضعدار اساتذۂ سخن کے ذکر سے ہی محسوس ہوتا رہے گا کہ ہمارے شہر میں ہر دور میں باکمال صاحبانِ علم و عرفاں رہے ہیں۔ قدرؔ عریضی صاحب کا نام بھی ایک استادِ سخن کی [illegible] سے خاص طور پر ہمارے شہر کے شعری و ادبی محفلوں میں لیا جاتا رہے گا۔

خورشید احمد جامی

جدید لفظیات کے باکمال و پُر وقار شاعر

ہمارے شہر میں اگر یہ چلن عام ہو جائے کہ ناقابلِ فراموش شاعروں کا نام سنہری حرفوں میں لکھا جائے تو ان میں ایک روشن نام خورشید احمد جامی کا بھی رہے گا۔ خورشید احمد جامی اپنی منفرد شاعرانہ طرزِ فکر کی وجہ سے اردو شعر و ادب میں ایک چشمۂ نور کی طرح رہیں گے فکر و فن کے آئینے میں خورشید احمد جامی کا ایک ایک شعر ناروں کے ہجوم میں کہکشاں کی طرح چمکتا رہتا ہے جامی صاحب کی شاعری اپنی مخصوص پہچان کے ساتھ باقی رہے گی۔ بلند قامت اعلیٰ درجہ کے قلمکار (شاعر و ادیب) جن کی تحریروں اور شاعرانہ عظمت کے سبب دامانِ فکر و خیال مہک رہے ہوں ان کو خراج پیش کرنا ان کے دور میں اور ان کی بعد کی نسلوں کے لئے ایک ایسی ذمہ داری ہے جس کو پورا کرنا ہر ایماندار اہلِ قلم کا فرضِ اولین ہے۔ خورشید احمد جامی بنیادی طور پر کلاسیکی غزل کے شاعر ہیں۔ اُن کا ابتدائی کلام اساتذۂ سخن کے

اسکول کی ترجمانی کرتا ہے لیکن اچانک اُن کا اسلوبِ شاعری بدل گیا اور کچھ ایسے جدید شعر کہنا شروع کیئے کہ ساری اُردو دنیا چونک گئی۔ جاؔمی صاحب کی جدید شاعری ہر اُس باشعور شاعر کے لئے سرمۂ نظر بن گئی جو اس طرح کی روشنی کے برسوں سے منتظر تھے جاؔمی صاحب کے اس منفرد شاعرانہ اسلوب سے پہلے ہندوستان اور پاکستان میں شاید ہی کوئی ایسا شاعر رہا ہو جو اُن کی شاعرانہ بصیرت کا ہم مزاج ہو جب ادبی حلقوں میں جاؔمی صاحب کے کلام کی شہرت عام ہوئی تو جدید قدیم شاعروں اور ادیبوں میں ان کا کلام اور شاعری پڑھنے کی خواہش ہونے لگی۔ جاؔمی صاحب کی شاعرانہ قدر و منزلت کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اُن کے مجموعۂ کلام رخسارِ سحر، برگِ آوارہ اور یاد کی خوشبو کا مطالعہ کیا جائے۔ خورشید احمد جاؔمی رسائل اور کتابوں کے شاعر ہیں یعنی ان کی پہچان مشاعروں کی معرفت نہیں ہوئی ادبی رسائل اور معیاری اخبارات میں کلام کی اشاعت کے علاوہ ان کے شعری مجموعوں کی بدولت ان کی شہرت ہوئی۔ یہ اور بات ہے کہ وہ شہر کے بعض مخصوص محفلوں میں کلام سناتے تھے۔ میرے خیال میں جاؔمی صاحب نے کوئی ایک بھی کل ہند مشاعرہ نہیں پڑھا۔ چاہے وہ حیدرآباد میں منعقد ہوا ہوگا یا کسی اور شہر میں۔ خورشید احمد جاؔمی کی غزلوں کی معرفت ہی میں ان تک پہونچا۔ جاؔمی صاحب سے میں اپنی ابتدائی شاعری کے زمانے میں واقف نہیں تھا بلکہ میں نے ان کا کلام

بھی نہیں سُناتھا۔ اُن دنوں میں اُن ہی شاعروں سے واقف تھا جو شہر کے چھوٹے بڑے مشاعروں میں کلام سُناتے تھے جب جاذی صاحب کا نام شہر کے شعری و ادبی حلقوں میں کچھ زیادہ ہی گونجنے لگا تو میرے دل میں بھی جاذی صاحب سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہوا ویسے میں "سیاست" میں اُن کا کلام پڑھتا تھا۔ آج سے ۳۰، ۳۲ برس پہلے جب میں اپنے شاعر دوستوں (رئیس اختر اور ناصر کرنولی وغیرہ) کے ساتھ مدینہ ہوٹل کی دوسری منزل (ایڈوکیٹ ہال) میں بیٹھا کرتا تھا اُس ہوٹل میں جاذی صاحب کو ہمیشہ ایک خاص کیبن میں دیکھتا تھا جاذی صاحب مدینہ ہوٹل کی دوسری منزل پر اپنی ایک مخصوص نشست پر بیٹھے رہتے۔ اُن کے آس پاس کوئی شاعر یا ان کا کوئی ایک مداح یا دوست ضرور ہوتا۔ میں جب پہلی دفعہ اُن سے ملا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ انہوں نے چائے سے تواضع کی۔ میرے بارے میں واقف تھے کہنے لگے میں تمہارے نام سے واقف ہوں "سیاست" میں تمہاری غزلیں پڑھتا ہوں۔ جاذی صاحب اپنے احباب اور اپنے ملنے والوں کی چائے سے تواضع کرتے تھے میرے ساتھ بھی وہ مشفقانہ سلوک کرتے تھے۔ مجھے اُن دنوں معلوم ہوا تھا کہ جاذی صاحب کے خاص شاگردوں میں خیرات ندیم صاحب کا نام سرِفہرست ہے جاذی صاحب انتہائی مروت پسند، محبت شناس شاعر تھے نوجوان شاعروں کی حوصلہ افزائی میں وہ فراخ دل واقع ہوئے تھے رئیس اختر اور میری شاعری کو بہت سراہتے تھے ایسے شاعر جو مشاعروں کے قبیلے سے

تعلق رکھتے ہیں ان کے بارے میں کہتے کہ سوم قبل، چہارم فیل ہیں ہنگس تخلص کے ساتھ آتے ہیں (تضحیک آمیز انداز میں تخلص کہتے تھے) جامی صاحب کا یہ خیال تھا کہ اگر کوئی شخص شاعر نہیں ہے تو اس کو شاعری کرنے کا کیا حق ہے ایسے لوگوں کو کوئی اور کام کرنا چاہیئے اگر جامی صاحب کو کسی شاعر کا کلام پسند نہ آتا تو کہتے تھے "گھاس لیٹ" ہے۔ جامی صاحب کی ہر تازہ غزل سیاست میں نمایاں طور پر اداریہ کے پیچھے شائع ہوتی تھی ان کے سارے کلام کو محفوظ رکھنے کا اہم کام ان کے خاص شاگرد رشید محمود خاور کے ذمہ تھا (جو ان دنوں پاکستان کے شہری ہیں) محمود خاور کی شخصی دلچسپی ہی کی وجہ جامی صاحب کے تینوں شعری مجموعے "رخسارِ سحر" "برگِ آوارہ" اور "بادِ خوشبو" شائع ہو سکے۔ میری معلومات کی حد تک جامی صاحب کے خاص شاگردوں میں حسب ذیل چار نام اہم ہیں رئیس اختر، پرنس نقی علیخاں ثاقب، محمود خاور اور عظمت عبد القیوم عظمت عبد القیوم اپنے استاد کا بڑا احترام کرتی تھیں جامی صاحب کے شاگردوں میں اوج یعقوبی، خیرات ندیم شاید ان کے زیادہ قریب تھے اُس دور کے شہر کے اہم شاعروں میں علامہ حیرت بدایونی، مخدوم محی الدین شاہد صدیقی، سلیمان اریب، وحید اختر، شاذ تمکنت اور مغنی تبسم سے ان کے شاعرانہ روابط تھے۔ جامی صاحب کہتے تھے کہ بعض شاعر اس بات کے لئے کوشاں رہتے ہیں کہ وہ مشاعروں کی دنیا سے بہت دور رہیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ جامی صاحب بڑے مشاعروں میں مدعو نہیں رہتے تھے۔ جامی صاحب شہر کے بعض مخصوص مشاعروں میں کلام سناتے تھے ان دنوں نقی علی خان ثاقب کے پاس مشاعرہ

ہوا کرتے تھے جامی صاحب لازماً ان مشاعروں میں شریک رہتے۔ بعض مشاعروں میں، میں نے بھی شرکت کی ہے۔ میں اور رئیس اختر جامی صاحب سے گاہے گاہے ملا کرتے تھے جامی صاحب کی رہائش سلطان پورہ میں تھی لیکن وہ صبح مدینہ ہوٹل میں اور شام میں اورینٹ ہوٹل میں بیٹھا کرتے تھے۔ کہیں ملازم نہیں تھے جی چاہتا تھا کہ جب کبھی فرصت ملے جامی صاحب کے ساتھ کچھ وقت گزارنا چاہیئے۔ جیسے ہی میں اُن کے پاس پہونچتا۔ علیک سلیک کے بعد چائے کے لئے آرڈر دیتے۔ تواضع کا یہ طریقہ کار ہر شاعر وادیب کے ساتھ علحدہ علحدہ رہتا تھا۔

میں جامی صاحب کی شاعری سے بے حد متاثر تھا اور جب اُن سے میں نے یہ سُنا کہ شہر کے کچھ شاعر، مشاعروں میں ان کی شرکت کے لئے رکاوٹ بنے رہتے ہیں تو یہ طے کیا کہ کیوں نہ انھیں شہر کے بڑے مشاعروں میں مدعو کیا جائے چنانچہ میں اور رئیس اختر نے جامی صاحب کو صنعتی نمائش کے دوران نمائش کلب میں منعقدہ ایک مشاعرہ میں کلام سنانے کے لئے اصرار کیا تھا وہ بہ مشکل شرکت کے لئے راضی ہوگئے۔ ہم تینوں مشاعرہ میں شرکت کے لئے نکل پڑے اُس مشاعرہ میں میں اور رئیس اختر بھی مدعو تھے راستے میں عثمان گنج کے روبرو ایک مشہور (شراب خانہ) کمل بار میں جامی صاحب نے چاہا کہ دم لیں۔ ہم نے ان کا ساتھ دیا لیکن ہم دونوں شریک جام و مینا نہیں رہے اُس شراب خانے سے اُٹھ کر ہم مشاعرہ گاہ (نمائش کلب) پہونچے۔ نمائش کلب سامعین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا مشاعرہ شروع ہو چکا تھا جیسے ہی ہم جامی صاحب کو ساتھ لیے

نشستوں پر بیٹھ گئے تمام شاعروں کی نظریں جاؔمی صاحب پر ٹک گئیں۔ بہت سے شرکائے محفل جاؔمی صاحب سے شخصی طور پر واقف نہیں تھے لیکن اُن کے کلام سے متعارف تھے مشاعرہ اپنے عروج پر تھا معتمدِ مشاعرہ نے جاؔمی صاحب کو دعوتِ سخن دی۔ جیسے ہی وہ اُٹھے تالیوں کی بارش ہونے لگی باذوق سامعین جاؔمی صاحب کی غزلیں "سیاست" میں پڑھا کرتے تھے جب جاؔمی صاحب نے کلام سنانا شروع کیا تو بے انتہا داد و تحسین سے انھیں نوازا جانے لگا۔ میں نے اپنے مشاعروں کی زندگی میں کسی شاعر کو اس قدر داد ملتے ہوئے نہیں دیکھا پہلے تو جاؔمی صاحب کے نام کے اعلان کے ساتھ ہی تالیوں سے ہال دیر تک گونجتا رہا۔ جب انہوں نے کلام سنانا شروع کیا تو مشاعرہ گاہ کی چھت اڑنے لگی۔ جاؔمی صاحب کو یہ اندازہ نہ تھا کہ انہیں اُن کے کلام پر اس قدر داد و تحسین سے نوازا جائے گا جاؔمی صاحب چاروں سمت مڑ مڑ کر داد و تحسین کے سیلاب میں شعر سنانے رہے۔ جاؔمی صاحب کی غیر معمولی پذیرائی سے میں بہت خوش ہوا۔ جاؔمی صاحب اُن دنوں رام کرشنا تھیٹر سے (ترپ بازار اردو گلی میں) متصل قادریہ نشیمن عمارت کے ایک کمرہ میں دن کے اوقات میں رہتے تھے۔ میں اُن سے وہیں مل لیا کرتا تھا۔ اکثر رئیس اختر بھی میرے ساتھ رہتے۔ ہماری خواہش پر جاؔمی صاحب اپنا تازہ کلام سناتے تھے۔

شاید ۳۵، ۳۶ سال پہلے کی بات ہے کہ میں بھیوانی (ہریانہ) کے ایک کل ہند مشاعرہ میں شرکت کے لئے گیا ہوا تھا وہاں کے غیر مسلم شاعروں نے خاص طور پر جاؔمی صاحب کے بارے میں پوچھا تھا اُس زمانے میں جاؔمی صاحب کا پہلا مجموعۂ کلام

رخسارِ سحر شائع ہو چکا تھا جس کو انجمن ترقی اُردو آندھرا پردیش نے شائع کیا تھا ہند و پاک کے ادبی رسائل کے ذریعہ جاؔمی صاحب نے تمام ادبی حلقوں کو متاثر کیا تھا سیاست اخبار کا جاؔمی صاحب کے ساتھ ہمیشہ تعاون رہا۔

خاص طور پر عابد علی خان صاحب، جگر صاحب جاؔمی صاحب کے کلام کو بہت پسند کرتے تھے امیر احمد خسرو جاؔمی صاحب کے چھوٹے بھائی تھے خسرو صاحب کے چھوٹے بھائی افتخار احمد اقبال ہیں جاؔمی صاحب کے بڑے بھائی نظامی صاحب شاعر تھے (یعنی ایں خانہ ہمہ آفتاب است) ان تمام بھائیوں میں خورشید احمد جاؔمی اور امیر احمد خسرو نے اُردو دنیا میں شہرت حاصل کی۔ جاؔمی صاحب نے مجرد زندگی گذاری (انہوں نے شادی نہیں کی) پتہ نہیں جاؔمی صاحب کے زیر مطالعہ کونسی کونسی کتابیں رہیں۔ یقیناً وہ قدیم و جدید اہم معیاری کتابوں کا مطالعہ کرتے رہے ہوں گے لیکن ان کی جدید شاعری کے لب و لہجہ کا ان کتابوں سے کوئی تعلق نہیں ہے کثرتِ مطالعہ اور اچھی کتابوں کے مطالعہ سے یقیناً انہیں روشنی ملی ہو گی لیکن انہوں نے اپنی شاعری کے لئے جو نیا اسلوب اختیار کیا وہ ان کا اپنا ذاتی ہے مانگے کا اجالا نہیں ہے ان کی فکر کا حاصل ہے جو شاعر کل تک کلاسیکی شعری ادبیات کا ترجمان تھا اُس کا اچانک ایک نئی شاعری کے ساتھ منظرِ عام پر آنا ایک اہم کرشمہ ہی ہو گا۔ جاؔمی صاحب کے شہر میں بہت ہی کم مخصوص دوست تھے غیر شاعر حضرات بھی اکثر ان کے ساتھ دکھائی دیتے تھے تعلیم منشی فاضل تک پائی تھی سُنا ہے کہ انہوں نے ابتدائی ملازمت محکمہ آبکاری میں کی۔ میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ ان کا ذریعہ معاش ان کی شاعری ہے انہیں کہیں نہ کہیں سے اُن کی شاعری

کا نذرانہ مل جاتا ہوگا یہ بات مشہور ہے کہ خانوادہ آصفیہ کے بہت سے افراد
اُن کی شاعرانہ صلاحیتوں سے مستفید ہوتے تھے۔ جاؔمی صاحب چائے بہت زیادہ
پیتے تھے پان بھی کھاتے تھے مے نوشی سے بھی اُن کا رشتہ تھا لیکن وہ بلانوش
نہیں تھے مخدوم محی الدین صاحب کا ذکر کرتے تو کہتے ہمارا قائد ہے۔ جاؔمی
صاحب کا کلام سلیمان اریب کی ادارت میں شائع ہونے والے ادبی رسالہ صبا
میں بھی چھپتا تھا صالحہ الطاف کی ادارت میں شائع ہونے والے ادبی رسالہ
خاتونِ دکن میں بھی شائع ہوتا تھا (جس کا میں مدیر اعزازی تھا) جاؔمی صاحب میری
خواہش پر اشاعت کے لئے اپنا کلام روانہ کرتے تھے ماہنامہ سب رس میں بھی
کلام شائع ہوتا تھا پاکستان کے تقریباً تمام رسائل میں خصوصیت کے ساتھ نمایاں
طور پر شائع ہوتا تھا جاؔمی صاحب کے انتقال کے بعد ان کے چھوٹے بھائی امیر احمد
خسرؔو نے ان کی یاد کو باقی رکھنے کے لئے ایک ادبی انجمن خورشید احمد جاؔمی میموریل
اکیڈیمی کے نام سے قائم کی۔ شاندار پیمانے پر گاندھی بھون میں افتتاحی جلسہ ہوا۔
شہر کے مشاہیر اُردو نے جلسے کو مخاطب کیا۔ ممتاز شاعر جناب رئیس اختر اکیڈیمی کے
جنرل سکریٹری ہیں جاؔمی اکیڈیمی کے زیرِ اہتمام ہر ماہ پابندی کے ساتھ امیر احمد خسرؔو کی
رہائش گاہ بسیرا گارڈن، سلطان پورہ میں ادبی اجلاس و مشاعرہ ہوا کرتا ہے
افتخار احمد اقبال صدر اکیڈیمی ہیں اور میں مشیرِ اکیڈیمی ہوں۔ اس معیاری
اکیڈیمی کے ماہانہ جلسوں کی وجہ سے جاؔمی صاحب کا نام ہر ماہ کئی بار اخبارات کی
زینت بنا رہتا ہے خورشید احمد جاؔمی ایک کم آمیز اور بے نیاز انسان تھے
انہیں اپنے نام و نمود اور اپنی شہرت کی کبھی خواہش نہیں ہوئی۔ اُن کا مزاج ہی

کچھ ایسا تھا کہ وہ اپنی ذات کی تشہیر سے گریز کرتے تھے جاقی صاحب کا نام اردو شعر و ادب میں ہمیشہ جگمگاتا رہے گا۔ ان کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف ہر دور میں کیا جاتا رہے گا۔

مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ ہمارے شہر کے دانشور جاقی صاحب جیسے عظیم شاعر کی عظمتِ فن کے بارے میں بہت کم سوچا کرتے ہیں ہمیں چاہیئے کہ ہم اپنے شہر کے اعلیٰ مرتبت شاعروں اور ادیبوں کے فن اور شخصیت کا اعتراف کرتے رہیں تاکہ آنے والی نسلیں ہمارے مستحسن اقدام کو پسند کریں اور جاقی صاحب کی شاعرانہ عظمت کو سلام کرتے رہیں۔

اوجؔ یعقوبی

جید استادِ سخن ۔ ملک الشعراء

جید استادِ سخن، ملک الشعراء اوج یعقوبی حیدرآباد کے اُن مستند اساتذۂ سخن میں سے ایک تھے جن کی شاعرانہ عظمت نہ صرف حیدرآباد کی ادبی فضاء پر چھائی ہوئی تھی بلکہ اضلاع کے شاعرانہ ماحول پر بھی اثر انداز تھی حیدرآباد ہر زمانے میں دانشوروں، ہنرمندوں، طرحداروں اور بلند مرتبت شخصیتوں کا جیتا جاگتا شہر رہا ہے۔ زندگی کے [illegible] شعبوں سے تعلق رکھنے والے اپنی اپنی صلاحیتوں کا اپنی اپنی محفلوں میں اظہار کرتے رہتے ہیں بے شمار لائق و فائق لوگوں نے اپنی فکر و دانش، فہم و ادراک اور اپنے نورِ بصیرت سے شہر کی دل آویز فضاؤں کو جگمگایا ہے شہر کی شعری و ادبی محفلوں میں کچھ اور شخصیتیں بھی نمایاں رہی ہیں جن کی شاعرانہ و ادیبانہ صلاحیتوں کو فراخ دلی کے ساتھ خراج پیش کیا جاتا رہا ہے پہلے دور کی طرح آج بھی ہمارے شہر میں کئی دانشور ایسے ہیں جو اپنے اپنے حلقوں میں اپنے بہترین فن کا مظاہرہ کر رہے ہیں اس لئے یہ کہنا حق بہ جانب

ہے کہ ہمارا شہر ہر دور میں باکمال، صاحبانِ علم و فن کا شہر رہا ہے۔ ہمارے شہر کے ایک بڑے شاعر اوج یعقوبی بھی ایک ایسے ہی شاعر تھے جن کی شاعرانہ عظمت ہر دور میں پورے اعتماد کے ساتھ خراج حاصل کرتی رہے گی میں اوج یعقوبی صاحب کا شاگرد رہا ہوں۔ مجھے اپنی طالب علمی کے زمانے سے ہی شعر و ادب سے دلچسپی رہی ہے۔ مجھے اساتذۂ سخن کے اچھے شعر یاد کرنے کا شوق تھا شاعری کے ابتدائی دور میں جو کچھ بھی میں کہتا تھا اپنی بیاض میں نوٹ کرتا تھا۔ میں کسی استاد سخن کو اپنا کلام دکھائے بغیر سناتا تھا۔ مجھے یاد ہے میں نے پہلی دفعہ کسی بزرگ کی عرس تقاریب کے موقع پر منعقدہ مشاعرہ میں اپنا کلام سنایا تھا۔ اُس مشاعرہ میں مولانا کامل شطاری، حضرت قدر عریضی اور سیف گھوسی اور رفاقت قریشی موجود تھے میرے ایک شاعر دوست نے ایک کم آمیز شاعر محمد افضل سے ملاقات کروائی اُن کے ساتھ میں نے گلی کوچوں میں ہونے والے کچھ مشاعرے پڑھے ہیں۔

ایک دن افضل صاحب نے مشورہ دیا کہ ہم اوج یعقوبی صاحب سے ملاقات کریں۔ انہوں نے ملاقات کروائی اور مشورہ دیا کہ ہم اوج صاحب کے تلامذہ میں شامل ہو جائیں۔ اس سے ایک فائدہ یہ ہوگا کہ اچھے استاد کی سرپرستی سے شاعرانہ رہبری حاصل ہوگی اور دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ اوج صاحب کے شاگرد بننے سے پرانا شہر میں ہونے والے مشاعروں میں مدعو کیے جاتے رہیں گے۔

اوج صاحب اُن دنوں مغل پورہ کمان سے متصل اپنے دوست کی ہوٹل میں ملازم تھے کیشئیر کاونٹر پر بیٹھا کرتے تھے۔ اسی ہوٹل میں اوج صاحب

سے ہماری ملاقات ہوتی تھی اور ہم دونوں اپنا کلام بغرض اصلاح پیش کرنے لگے۔ اُن دنوں ہم دونوں نے اپنا کلام علامہ قدر عریضی کو بھی دکھلانا شروع کیا تھا۔ یہ یاد نہیں رہا کہ ہم کس کے توسط سے قدر صاحب کے پاس پہنچے تھے۔
اوج صاحب کی استادی کے زمانے میں ہم نے پرانے شہر کے بے شمار مشاعرے پڑھے جس سے ہماری شہرت میں روز افزوں اضافہ ہونے لگا۔ اوج صاحب کا طریقۂ اصلاحِ سخن نہایت آسان تھا وہ غیر ضروری طور پر ہماری غزل کے مصرعوں میں اپنے مصرعے جوڑنے کے قائل نہ تھے جہاں بھی ضرورت محسوس ہوتی وہ مصرعوں کو درست کرتے تھے۔ اُس زمانے میں طرحی مشاعروں کا بہت رواج تھا ہم نے کئی طرحی مشاعرے پڑھے ہیں خاص طور پر زاویۂ ادب کے مشاعرے جس کے سربراہ علامہ نجم آفندی تھے۔ مولانا کامل شطاری کی رہائش گاہ پر بھی ہر ماہ پابندی کے ساتھ منعقدہ مشاعروں میں بھی ہم کلام سنایا کرتے تھے۔ ان دنوں مختلف انجمنوں کے زیر اہتمام ہر ماہ پابندی سے مشاعرے ہوتے تھے ہم استاد کے شاگرد مشاعروں میں مدعو رہتے تھے۔ اوج صاحب نے کلام کی اصلاح کے سلسلے میں کبھی بیزارگی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ غزل کی تصحیح اُسی وقت کرتے تھے اگر وہ مصروف رہتے تو دوسرے دن اُسے درست کر دیتے تھے۔ اُس زمانے میں اوج صاحب کا طوطی بولتا تھا اُن کے قریب ترین دوستوں میں خواجہ شوق کے علاوہ سید شہیدی، راز عابدی اور خیرات ندیم ہوتے۔ اوج صاحب نے کبھی بھی علم عروض کے بارے میں کچھ نہیں بتایا اور نہ ہی انہوں نے اپنے کسی شاگرد کو علم عروض سے واقف ہونے کے لئے اصرار کیا۔ وہ کہتے تھے مشقِ سخن سے ایک خاص آہنگ پیدا ہو جاتا ہے اور شاعر

رواں دواں شعر کہنے لگ جاتا ہے۔ میں نے اپنی ابتدائی شاعری کے زمانے میں
اوج صاحب کی معرفت شہر کے علاوہ اضلاع کے مشاعرے بھی پڑھے ہیں
اوج صاحب کے بیسیوں شاگرد ہیں۔ اوج صاحب کا کلام سیاست کے مختلف شعر
ہیں بھی شائع ہوا ہے سنڈے ایڈیشن میں بھی برسوں چھپتا رہا ہے اوج صاحب
سے عابد علی خان صاحب اور جگر صاحب واقف نہیں تھے۔ سیاست میں
"شیشہ و تیشہ" کے کالم میں مزاحیہ اشعار شائع ہوتے تھے شاہد صدیقی صاحب
شاعر سیاست کے نام سے شیشہ و تیشہ کالم لکھا کرتے تھے شاہد صاحب جس وقت
ایک مشاعرہ کے سلسلے میں کشمیر گئے ہوئے تھے ان کی غیر موجودگی میں اوج صاحب نے سیاست
کے شیشہ و تیشہ کالم کے لئے شاعر سیاست کے نام سے کچھ شعر لکھ کر ایڈیٹر سیاست کے
نام روانہ کئے جو شائع ہوئے۔ جگر صاحب نے مجھ سے دریافت کیا تھا کہ یہ کون
شاعر ہے مجھے معلوم تھا کہ وہ شاعر اوج یعقوبی ہیں۔ میں نے یہ کہا تھا کہ اوج صاحب
ہمارے شہر کے استاد شاعروں میں سے ایک ہیں انہوں نے ہی یہ نظم بھیجی تھی۔ پھر میں
نے جگر صاحب کے کہنے پر اوج یعقوبی صاحب کا تعارف کروایا۔ تعارف کے بعد
اوج صاحب کی غزلیں، نظمیں سیاست کے خصوصی کالموں میں شائع ہوتی
رہیں۔ شاہد صدیقی صاحب کے انتقال کے بعد اوج صاحب شیشہ و تیشہ کالم کے لئے
ہر ہفتہ اشعار بھیجنے لگے۔ اوج صاحب کو حکومت آندھرا پردیش نے جبکہ ٹی انجیا
صاحب چیف منسٹر تھے ملک الشعراء کے اعزاز سے نوازا تھا پھر اس شہر میں
واقع حسینی علم گرلز اسکول کے احاطہ میں زیر اہتمام کل ہند مجلس اتحاد المسلمین
کل ہند مشاعرہ ہوا تھا۔ چیف منسٹر صاحب نے اس مشاعرہ کا افتتاح کیا تھا

اس مشاعرہ میں چیف منسٹر صاحب نے اوج یعقوبی صاحب کو ملک الشعراء
کے اعزاز سے نوازا تھا۔ اعلان کے بعد سلطان صلاح الدین اویسی صاحب
نے چیف منسٹر صاحب کے نام اردو میں ایک خط لکھ کر توجہ دلائی تھی کہ آپ
نے ملک الشعراء کا اعلان تو کیا لیکن آرڈر جاری نہیں ہوئے ہیں۔ میں چیف منسٹر صاحب
کے پی اے جناب خواجہ معین الدین سے کسی کام کے سلسلے میں ملنے کے لئے گیا ہوا تھا۔ وہاں
میں نے دیکھا کہ سلطان صلاح الدین اویسی کا خط ٹرے میں رکھا ہوا ہے۔ خواجہ معین الدین
میرے بہترین دوستوں میں سے ایک ہیں ہم دونوں کی ابتدائی ملازمت ڈائرکٹر
کمیونیٹی پروجکٹ آفس سے شروع ہوئی تھی وہ وہاں ٹائپسٹ تھے اور میں
کلرک۔ سکریٹریٹ میں بھی ہم دونوں پنچایت راج ڈپارٹمنٹ میں ساتھ ساتھ
رہے۔ خواجہ معین الدین کے اجلاس پر نرسمہا ریڈی اسسٹنٹ سکشن آفیسر متعین
تھے نرسمہا ریڈی بھی میرے آفس کے ساتھی اور دوست تھے۔ نرسمہا ریڈی نے
دوران گفتگو مجھ سے کہا۔ یہ اوج یعقوبی کون ہیں؟ ان کے بارے میں اویسی
صاحب کا یہ خط پڑھ لو۔ میں نے نرسمہا ریڈی سے کہا کہ یہ خط بہت اہم ہے فی الفور
محکمۂ تعلیمات کے نام بھیج دو۔ چنانچہ وہ خط چیف منسٹر صاحب کے پی اے کے نوٹ
کے ساتھ محکمۂ تعلیمات کو روانہ کیا گیا۔ ان دنوں اوج صاحب اس کارروائی
کے سلسلے میں سکریٹریٹ آتے رہتے تھے لیکن انہوں نے اپنی کارروائی کے سلسلہ میں
کچھ نہیں بتایا۔ میں نے محکمۂ تعلیمات کے متعلقہ سکشن آفیسر مسٹر رادھا کشن جو
میرے ہم عہدہ آفیسر تھے ملاقات کی۔ ملک الشعرا کی کارروائی کا لیٹر چیف منسٹر
صاحب کے پاس سے سکشن کو پہونچ گیا تھا لیکن کوئی کارروائی نہیں ہوئی تھی مسٹر

رادھاکشن نے وہ لیٹر میرے حوالے کرتے ہوئے کہا کہ میں اردو نہیں جانتا۔ انگریزی میں ٹرانسلیشن کروا لیجیے۔ میں نے محکمۂ قانون کے اپنے ایک دوست عبدالغفار اسسٹنٹ سکشن آفیسر سے ترجمہ کروایا اور بہ حیثیت گزیٹیڈ آفیسر میں نے اُس پر دستخط کیے۔ اس کے بعد کارروائی کا آغاز ہوا۔ میں نے نہایت خاموشی کے ساتھ جی۔ او جاری کروایا۔ میں نے اس کام کی کوئی تشہیر نہیں کی اس لیے کہ مجھے معلوم ہوا تھا کہ شہر کے کچھ شعراء جی۔ او کے خلاف کورٹ سے STY لانے والے ہیں۔ تقریباً ۸ بجے شب جی۔ او جاری کروایا گیا اور میں سکریٹریٹ سے سیدھے آل انڈیا ریڈیو پہونچا اور ملک الشعراء کے نام کا اعلان کروایا۔ اخبارات میں بھی ملک الشعراء کی اطلاع چھپوائی گئی۔ میری بے تکان کدوکاوش سے اوج صاحب بے حد خوش ہوئے۔ کچھ عرصہ تک اوج صاحب ملک الشعراء رہے لیکن ان کے انتقال کے بعد کوئی اور ملک الشعراء کا اعزاز نہ پا سکا۔

اوج یعقوبی صاحب نہ صرف غزل کے اعلیٰ درجہ کے شاعر تھے بلکہ ان کا مذہبی کلام نعتیں، منقبتیں بھی اعلیٰ معیار کی ہیں اوج صاحب کے مجموعۂ کلام تین ہیں گرفتِ نظر، غنچۂ لب بستہ اور نعتوں اور منقبتوں کا مجموعہ (اوج عرش) اوج صاحب کے شاگرد اطہر شرفی اور زیرک شرفی کی زیرِ نگرانی شائع ہوا۔ اوج صاحب پرنس معظم جاہ شجیع کے شاعرانہ دربار سے عرصۂ دراز تک وابستہ رہے۔ اوج صاحب کی زندگی نہایت تنگ دستی کے عالم میں گذرتی رہی۔ وہ کہیں بھی ملازم نہیں رہے۔ شہر کے اساتذۂ سخن میں اہم مقام رکھتے تھے اوج صاحب کا کلام حاصلِ مشاعرہ رہتا تھا ادبی ٹرسٹ اور

شنکر جی مشاعرہ کے اہم ترین میزبان شاعر رہتے۔ جم کر شعر سناتے تھے
تحت اللفظ میں شعر سناتے تھے سنانے کا انداز منفرد تھا سارے مشاعرے
پر چھا جاتے تھے۔ کل ہند مشاعروں کے علاوہ اضلاع کے مشاعروں میں
شرکت کرتے تھے رسائل میں کلام شائع نہیں کرواتے تھے اس لئے
ملک کے ادیب و شاعر اوج یعقوبی صاحب سے بہت کم واقف ہیں
اوج صاحب جہاں اعلیٰ درجہ کی شاعری کرتے تھے وہیں وہ بہت عمدہ
نثر بھی لکھتے تھے۔ اوج صاحب کی کم آمیزی نے ملک کے ادبی حلقوں
سے انہیں دور رکھا۔ سیاست اخبار نے اوج صاحب کی حوصلہ افزائی
کی۔ اوج صاحب کے فن پر تبصرہ کے لئے جگر صاحب نے نظام کلب میں
زیر صدارت علامہ حیرت بدایونی ایک جائزہ اجلاس رکھا تھا مبصرین
میں میر حسن صاحب سابق ڈائرکٹر آل انڈیا ریڈیو بھی تھے اس محفل کا
کنوینر میں تھا سیاست کے زیر اہتمام اس طرح کے بیسیوں اجلاس مختلف
موضوعات پر منعقد کئے جاتے رہے ہیں سیاست میں کئی برس پہلے اچھے
اشعار کے زیر عنوان اشعار شائع ہوتے رہے۔ اچھے اشعار کی اشاعت
کا سلسلہ ۳ ، ۴ سال تک جاری رہا۔ اس کالم کی ترتیب میرے ذمے تھی۔
مہینہ میں ایک بار بہترین اشعار کے انتخاب کے لئے مجلس کا اجلاس ہوتا تھا
اوج صاحب بھی جج کے فرائض انجام دے چکے ہیں۔ طریقہ کار کے لحاظ سے
انعام کے اعلان کے ساتھ مجلس کی تصویریں شائع ہوتی تھیں اوج صاحب
حضرت بنے میاں (اورنگ آباد) کی سالانہ عرس شریف تقاریب کے

مشاعروں میں پابندی کے ساتھ شرکت کرتے تھے ان کا انتقال عرس شریف کے مشاعرہ کے دوسرے دن اورنگ آباد میں ہوا۔ انھیں حیدرآباد میں مسجد الٰہی چادرگھاٹ کے قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔

حکومت آندھراپردیش نے اوج صاحب کو ملک الشعراء قرار دیا لیکن ملک الشعراء کے اعزاز سے وہ زیادہ عرصہ تک استفادہ نہ کرسکے اوج صاحب کی شاعرانہ خدمات کے اعتراف میں کھمم میں جشن اوج یعقوبی شاندار پیمانے پر منایا گیا جناب سکندر محسن معتمد انجمن ترقی اردو کھمم کی شخصی دلچسپی کی وجہ یہ تقریب منعقد ہوئی۔ سکندر محسن اضلاع کے شاعروں میں ایک نمائندہ شاعر ہیں غالباً اوج صاحب سے انہوں نے مشورۂ سخن کیا تھا۔ اوج صاحب ایک زمانے میں (۳۵ برس پہلے) ہوٹل تفریح کرتا واقع قریب نیا پل شام کے وقت بیٹھا کرتے تھے۔ وہاں میں نے کئی بار اُن سے ملاقات کی ہے اکثر دفعہ شوق صاحب کو بھی میں نے اُن کے ساتھ دیکھا ہے۔ وہ کئی ادبی انجمنوں سے وابستہ رہے۔ اوج صاحب کو شہر کے ہر اہم مشاعرہ میں مدعو کیا جاتا تھا مولانا معز ملتانی سے بھی اوج صاحب کے اچھے تعلقات تھے مشہور شاعرہ عزیز النساء صبا اوج صاحب کی شاگرد رہ چکی ہیں حیدرآباد میں اوج صاحب کے بہت سے شاگرد رہے۔ اوج صاحب ہمیشہ مجھ سے کہتے کہ کبھی پیچھے مڑکر نہیں دیکھنا۔ ہمیشہ اپنے قدم بڑھاتے رہو مخالفت کی پرواہ کئے بغیر اپنا شعری سفر جاری رکھو۔ بڑا حوصلہ دیا کرتے تھے حیدرآباد میں اوج صاحب کے شاگردوں میں راز عابدی اور ذاکر گودڑشاہی

کا نام بھی شہرت رکھتا ہے۔ حضور نظام کے خاندان سے وابستہ بعض افراد بھی اوج صاحب سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ کل ہند مجلس اتحاد المسلمین کے زیر اہتمام ہونے والے کل ہند نعتیہ مشاعرہ میں لازماً مدعو کیے جاتے رہے ہیں جیسا کہ میں نے کہا ہے کہ شاعری میں میرے دو استاد تھے ایک علامہ قدر عریضی دوسرے اوج یعقوبی صاحب۔ میں نے احتیاط یہ کی کہ ابتدائی شاعری میں مشق کے زمانے کی تمام شاعری کو کسی ایک مجموعۂ کلام میں بھی شامل نہیں کیا۔ چونکہ شاعری کی ابتدائی زمانے میں ہر نئے شاعر کے کلام میں استاد کی مہربانیاں کچھ زیادہ ہی ہوتی ہیں۔ جب مجھ میں خود اعتمادی آ گئی تو میں نے کسی کو بھی اپنا کلام بغرض اصلاح نہیں بتلایا۔ اوج صاحب جیسے اساتذۂ سخن کا کہیں بھی ذکر چلتا ہے تو بے ساختہ زبان پر یہ مصرعہ آ جاتا ہے۔

" زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے "

سعید شہیدی

تمہارے شعر ہر اک دل کی دھڑکنوں میں ہیں

حیدرآباد کی محفلوں میں جہاں کہیں بھی کسی شاعر کی شاعری اس کی کج کلاہی اس کی مخصوص بانکپن اور اس کی سنجیدگی فکر و خیال کا تذکرہ ہوگا وہاں کے دانشورانِ شعر و ادب کے لبوں پر بے ساختہ سعید شہیدی کا نام بھی آجائے گا سعید شہیدی جیسے بلند مرتبت شاعر کے مزاج میں انانیت نہیں تھی ایک بانکپن تھا۔ شاعرانہ لب و لہجہ ان کی ایک شناخت تھی۔ سعید شہیدی نے اپنی فکر انگیز غزلوں پر تبصرہ و تنقید کو کبھی خاطر میں نہیں لایا۔ تبصرے و تنقیدیں ہوتی رہیں لیکن انہوں نے اپنی شاعرانہ روش کو نہیں بدلا۔ کہا جاتا رہا کہ سعید شہیدی کا کلام عصرِ حاضر کی شاعری سے ہم آہنگ نہیں ہے لیکن انہوں نے کبھی اس بات کو تسلیم نہیں کیا بلکہ بیشتر ایسے نقادانِ شعر و سخن بھی ہیں جنھوں نے ان کے کلام پر تبصروں سے یہ ثابت کر دکھایا کہ شگفتہ رنگ سخن میں بھی سعید شہیدی نے اعلیٰ درجہ کے مضامین باندھے ہیں جو فکر و خیال کے غماز ہیں اور ہر

دور میں جو قابلِ توجہ بنے رہیں گے۔ عصری حیثیت بھی اُن کے کلام میں ملتی ہے۔ سعید شہیدی کی زیادہ تر غزلیں سہلِ ممتنع میں ہیں۔ برق و آشیاں کا استعارہ شاعرانہ شان کے ساتھ اُن کے اشعار کی معنویت کو چار چاند لگا دیتا ہے سیدھے سادے ہلکے پھلکے لفظوں کو شاعرانہ رنگ میں ڈھالنا ہر ایک شاعر کے بس کی بات نہیں ہے۔ سعید شہیدی کی غزلوں کو نامور گلوکاروں نے اپنی بہترین غزل گائیکی سے بام عروج پر پہونچا دیا ہے۔ سعید شہیدی ایک منفرد شاعرانہ حیثیت کے حامل تھے اور منفرد شاعری کی طرح پاک و صاف اعلیٰ خصوصیات رکھتے تھے ان کے کلام میں کچھ ایسی بات ہے کہ سننے اور پڑھنے والا ان کی غزلوں کے تاثر کو دل و جان سے قبول کرتا ہے۔ سعید شہیدی کا کلام ان کی کتابوں ریڈیو، دوردرشن، اخبارات و رسائل اور مشاعروں کے ذریعہ اردو عوام اور اردو کے صاحبانِ ذوق تک پہونچ چکا ہے۔ سعید شہیدی انتہائی محتاط اور رکھ رکھاؤ کے انسان تھے۔ ہر شخص سے وہ گھل مل نہیں جاتے تھے۔ بہت کم مسکراتے تھے ان کے چہرہ پر ہمیشہ سنجیدگی طاری رہتی۔ خاموش طبیعت اور اپنے وجود میں گم رہا کرتے تھے۔ مشاعروں میں شرکت کرتے تو خاموشی اُن پر چھائی رہتی۔ بہت کم کسی شاعر سے بات کرتے تھے کسی شاعر کا کوئی شعر پسند آتا تو داد دیتے نہیں تو چپ سادھ لیتے تھے وہ متشاعروں کو سننا نہیں چاہتے تھے۔ شاعروں کا مشاعرہ انہیں زیادہ پسند تھا۔ اُن کے ہم عصر پرانے شہر کے شاعروں میں

ڈاکٹر علی احمد جلیلی، اوج یعقوبی، خورشید احمد جامی، امیر احمد خسرو، خواجہ شوق اور خیرات ندیم کو اپنا ہم مرتبہ شاعر سمجھتے تھے۔ سعید شہیدی کی وضع داری اور ان کی کج کلاہی منفرد تھی۔ اُن کا یہ انداز کسی اور شاعر میں نہیں ملتا۔ شہر میں بیسوں شاعر ہیں سینئر بھی، جونیئر بھی لیکن ان کی پہچان بالکل الگ طرح کی تھی۔ کلام کے لحاظ سے بھی ان کی شخصیت کے لحاظ سے بھی۔ سعید شہیدی نہایت ذکی الحس شاعر تھے نازک طبع اور نازک مزاج انسان تھے آداب مشاعرہ کا خود بھی خیال رکھتے تھے اور دوسروں سے بھی ایسی ہی توقع رکھتے تھے۔ سعید شہیدی کو میں اُس وقت سے جانتا ہوں جب میں بھی شاعری کے ابتدائی دور میں تھا۔ سعید شہیدی کو سفینۂ ادب، زاویۂ ادب اور مولانا کامل کی رہائش گاہ پر منعقدہ مشاعروں میں سنتا رہا ہوں۔ وہ اپنے بہترین کلام اور منفرد ترنم کے سبب مشاعرے لوٹ لیتے تھے۔ اکثر مشاعروں میں سب سے زیادہ داد پانے والے شاعر رہتے تھے سعید شہیدی صاحب سے میری باضابطہ کبھی ملاقات نہیں ہوتی تھی۔ رفتہ رفتہ ہمارے مراسم بڑھنے لگے۔ میں ایک جونیئر شاعر کی حیثیت سے ہمیشہ سعید شہیدی صاحب کا احترام کرتا تھا۔ ۱۹۶۶ء میں "سیاست" کے لئے سعید شہیدی صاحب پر ایک تعارفی مضمون لکھا تھا۔ اس ملاقات کے بعد ہم ایک دوسرے کو کچھ زیادہ ہی محسوس کرنے لگے۔ ۱۹۶۴ء سے تقریباً تین سال تک شعراء کے تعارفی مضامین روزنامہ سیاست کے کالم میں ہر چہارشنبہ کو چھپتے رہے۔ اسی کالم کے سلسلے میں ڈاکٹر علی احمد جلیلی سے بھی ملاقات رہی۔ اس کالم

ہیں شاعر کا تعارف اور نمونۂ کلام شائع ہوتا تھا۔ اُن تمام شعراء کے تمام شعری مجموعے میرے زیرِ مطالعہ رہے ہیں۔ اساتذۂ سخن کے کلام کے مطالعہ سے مجھے روشنی ملی۔ اُس دور میں سعید شہیدی کی بے حد شہرت تھی مشاعروں کے وہ بے حد مقبول شاعر تھے۔ میں نے بھی اہم اہم مشاعروں میں سعید شہیدی کو مدعو کیا ہے۔ سعید شہیدی اپنے شاعرانہ بانکپن کو ملحوظ رکھتے ہوئے بعض دفعہ منتظمینِ مشاعرہ کے لئے مسئلہ بنے رہتے تھے۔ مشاعرے کے دعوت نامے اُنھیں گھر پر دینا پڑتا تھا اور مشاعروں میں شرکت کرنے کے لئے اصرار ضروری ہوتا۔ وہ مشاعرہ میں شرکت کے لئے فی الفور اپنی رضامندی نہیں دیتے تھے اور سرِ راہ یا کسی محفل میں مشاعرہ کا دعوت نامہ قبول نہیں کرتے تھے۔ لیکن مجھے یہ اجازت تھی کہ میں تمام مشاعروں میں شرکت کے لئے انہیں صرف فون پر دعوت دیتا تھا وہ اپنی کرم نوازی سے شرکت کرتے تھے وہ کہتے تم کو اختیار ہے کہ مجھ سے پوچھے بغیر میرا نام دے سکتے ہو۔ لیکن دوسروں کو یہ حق نہیں پہونچتا کہ میری منظوری کے بغیر اخباروں میں میرا نام دیں۔ ویسے میں اکثر دفعہ فون پر ہی اطلاع دیا کرتا تھا۔ اگر بر وقت ربط پیدا نہ ہو سکا تو ان کا نام اخبارات میں دیا جاتا تھا۔ کئی کل ہند مشاعروں میں ہمارا ساتھ رہا۔ مجھے اور رئیس اختر کو بہت چاہتے تھے۔ کہتے تھے تم دونوں مجھے بے حد عزیز ہو۔ یہ اعزاز شاید ہی کسی جونیر شاعر کو حاصل رہا ہو۔ سعید شہیدی، ادبی ٹرسٹ اور شنکر جی مشاعروں کے لئے ناگزیر تھے لازماً ان دونوں مشاعروں میں مدعو ہوتے

ان دونوں مشاعروں کے علاوہ شہر میں کسی بھی ادارے یا انجمن کی جانب سے کل ہند مشاعرہ ہوتا تو سعید شہیدی کو خصوصیت کے ساتھ مدعو کیا جاتا تھا۔ عابد علی خان صاحب سے ان کے گہرے مراسم تھے سعید شہیدی کی ہر تازہ غزل "سیاست" میں شائع ہوتی تھی۔ سعید شہیدی بہ نفس نفیس سیاست آتے، جگر صاحب کو اشاعت کے لیے غزل دیتے جو اولین اشاعت میں شامل رہتی۔ شہر میں عابد علی خاں صاحب کے زیر انتظام جہاں بھی مشاعرے ہوتے رہے سعید شہیدی صاحب کو مدعو کیا جاتا رہا ہے سرکاری ہو کہ غیر سرکاری ہر مشاعرہ میں شریک رہتے وہ تقریباً تمام صدر جمہوریہ ہند کو کلام سنا چکے ہیں راج بھون کے تمام مشاعروں میں کلام سناتے رہے ہیں سعید شہیدی امریکہ، لندن کے مشاعروں کے علاوہ سعودی عرب (جدہ) اور دوحہ قطر کے مشاعروں میں بھی شرکت کر چکے ہیں سعید شہیدی کے تاحال چار شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن کے نام یہ ہیں۔ برق و آشیاں، شفق، آفتابِ غزل، کفِ گل فروش۔

سعید شہیدی صاحب کا کلام آج بھی نامور گلوکاروں کے ذریعہ ہم تک پہونچتا ہے۔ اردو اکیڈیمی کے مخدوم ایوارڈ کے پیانل میں سعید شہیدی صاحب کا نام بھی شامل تھا لیکن کچھ ایسا ہوا کہ مخدوم ایوارڈ کا فیصلہ ان کے حق میں نہیں ہوا۔ اس کی تفصیل سے تمام ادبی حلقے واقف ہیں اضلاع کے مشاعروں میں سعید شہیدی کو مدعو کرنا لازمی ہوتا تو منتظمینِ مشاعرہ

میرے پاس آتے۔ میں اپنے طور پر انہیں دعوت مشاعرہ دیتا اور ہم ذریعہ کار مشاعروں میں چلے جاتے۔ ۲۰، ۲۵ برس سے ہم صرف ذریعہ کار ہی اضلاع کے مشاعروں میں شرکت کر رہے ہیں۔ ہم خیال شاعروں کے ساتھ مشاعروں میں شرکت کرنے کا مزہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔

دوران سفر سعید شہیدی صاحب ہم شاعروں کی گفتگو سنتے رہتے تھے بہت کم کچھ کہتے۔ بلا ضرورت کبھی کسی موضوع پر گفتگو نہیں کرتے تھے سعید شہیدی ایوان پرنس معظم جاہ شجیع کے مشاعروں میں پابندی سے شرکت کرتے تھے ایوان کے مشاعروں میں کبھی سعید شہیدی اور کبھی علی احمد جلیلی صدر مشاعرہ رہتے۔ شہر کے بیشتر مشاعرے جو میرے زیر انتظام رہتے زیادہ تر مشاعروں کی صدارت سعید شہیدی ہی کرتے تھے صنعتی نمائش کے موقع پر ہونے والے مشاعرے کی صدارت لازمی طور پر سعید شہیدی کی سپرد کی جاتی۔ ریڈیو کے مشاعرے ہوں کہ دُور درشن کے مشاعرے ہوں۔ سعید شہیدی ہی صدارت کرتے تھے سعید شہیدی ایک محتاط انسان تھے کسی سے کبھی کھل نہیں پاتے تھے ہمیشہ بند بند رہتے تھے ان کے والد محترم نواب شہید یار جنگ کی وضع داری اُن کے مزاج میں رچ بس گئی تھی پرنس معظم جاہ شجیع کے شاعرانہ دربار میں بھی شریک رہتے تھے سعید شہیدی تقریباً ۶۰ ۔ ۶۵ سال سے شاعری کرتے رہے۔ کسی کو کبھی یہ نہیں معلوم ہوا کہ ان کے شاگرد کون کون ہیں۔ غالباً وہ استاد شاگرد کی چکر میں پڑنا نہیں چاہتے تھے وہ تنہائی کے عادی تھے مزاج

بھی ایسا پایا تھا کہ انہیں تنہائی زیادہ پسند تھی۔ میرا شہر میرے لوگ کی ادبی محفلوں میں پابندی کے ساتھ شرکت کرتے تھے اسی طرح خورشید احمد جامی میموریل اکیڈیمی کے مشاعروں میں بھی شریک رہتے۔ کئی مشاعرے سعید شہیدی کی صدارت میں منعقد ہوئے۔ مخدوم ایوارڈ کے بروقت اعلان نہ کئے جانے سے وہ ایک قسم کی ذہنی کوفت میں مبتلا تھے۔ انھیں توقع تھی کہ مخدوم ایوارڈ انہیں ملے گا لیکن ادبی و سیاسی بازیگر نے انہیں ایوارڈ سے محروم رکھا۔ ان کے انتقال کے بعد مخدوم ایوارڈ کا اعلان کیا گیا جو خواجہ شوق کے حصہ میں آیا۔ سعید شہیدی کی ملازمت کا رشتہ محکمۂ آبکاری سے تھا۔ ایک دفعہ مجھے ان کے آفس جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ استادِ سخن اوج یعقوبی بھی ساتھ تھے۔ اوج صاحب کی قیادت میں ہم تمام شاعر ضلع کے کسی مشاعرہ میں جانے والے تھے۔ سعید شہیدی صاحب، علامہ نجم آفندی کے سینیئر تلامذہ میں سے تھے وہ اپنی افتادِ طبع کی وجہ سے ہر کس و ناکس کو منہ نہیں لگاتے تھے۔ سعید شہیدی کو ہم نے مشاعروں میں شرکت کے لئے ہمیشہ ترجیح دی۔ ادبی ٹرسٹ اور شنکر جی مشاعرہ میں شرکت کرتے رہے۔ ان کا کہنا تھا کہ آج مشاعروں میں اگلی سی روایت باقی نہیں رہی۔ ان دنوں بڑے مشاعروں میں اکثر سامعین کو شاعر کے کلام سے کوئی دلچسپی نہیں رہتی۔ کچھ لوگ تو تفریحاً چلے آتے ہیں۔ کس شاعر کی کیا شاعرانہ حیثیت ہے انہیں کچھ نہیں معلوم۔ اس لئے وہ بالعموم بڑے مشاعروں میں شرکت سے اجتناب کرتے تھے سعید شہیدی

کے اعتراف خدمات کی تقاریب کئی انجمنوں نے منعقد کیں لیکن ایک تہنیتی اجلاس جو ۲۰-۲۲ برس پہلے اسٹیٹ ٹاکیز میں ہوا تھا قابل ذکر ہے۔ جناب عابد علی خان کی صدارت میں تہنیتی تقریب ہوئی تھی اس تقریب میں سعید شہیدی صاحب کو ۵۱ ہزار روپے کا کیسہ زر پیش کیا گیا تھا۔ غزل کے مشاعروں کے علاوہ سعید شہیدی کئی مذہبی مشاعرے اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک میں پڑھ چکے ہیں۔ عابد علی خان صاحب اور جگر صاحب کے انتقال کے بعد بھی سعید شہیدی کا سیاست سے رابطہ رہا۔ زاہد علی خان صاحب، سعید شہیدی کا بہت احترام کرتے تھے سعید شہیدی جب کبھی سیاست آتے تو مجھ سے لازماً ملا کرتے تھے کچھ دیر میرے پاس بیٹھتے بڑی خوشی ہوتی۔ میں کھڑے ہو کر سعید بھائی کا خیر مقدم کرتا اور تاوقتیکہ وہ مقابل کی کرسی پر نہ بیٹھتے۔ میں کھڑا رہتا۔ خوشبو کا سفر میں بھی سعید شہیدی صاحب کی غزلیں شائع ہوئی ہیں۔ آج سعید شہیدی صاحب ہم میں نہیں ہے لیکن اُن کی یادیں ہمارے ساتھ ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو موت کی آغوش میں رہ کر بھی زندگی کے سفر کا احساس دلایا کرتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سعید شہیدی ہمارے ساتھ ہیں ہماری سانسوں میں بسے ہوئے ہیں ان کی شخصیت کی خوشبو ان کی شاعری کی عظمت ہمارے لئے ایک عظیم ورثہ ہے جس کی ہم دل و جان سے حفاظت کر رہے ہیں۔ جسے ہم کبھی فراموش نہیں کر سکتے

سلیمان اریب

"پاسِ گریباں" اور "کڑوی خوشبو" کا شاعر

مزاج کی طرح داری، طبیعت کے بانکپن اور شاعرانہ کج کلاہی کو زیب و زینت داستانِ حیات اور سرشاری، خیر و برکت کا سرچشمۂ فیضان سمجھنے والے کتنے ایسے شاعر ہوں گے جو شعر و ادب کی بارگاہ میں سجدہ ریز نہ ہوئے ہوں گے کتنے ایسے واقفِ رموزِ کائنات ہوں گے جو اپنے فکر و فن کی سحر کاری سے دیدۂ پُرنم اور لبِ فنداں کے لئے مژدۂ نغمۂ جاں فزا بن گئے ہوں گے۔ ہمیں زندگی کی رعنائیوں اور نیرنگِ حیات کی نغمہ سرائی کرنے والے فن کار تو مل جائیں گے لیکن ایسے تخلیق کار بہت کم ملیں گے جو اُجالوں کا پیغام دیتے ہوئے معاشرہ کو نت نئے رنگ و روپ سے سرفراز کرتے ہوں گے۔ ایسے شاعر جو اپنے دل کی دھڑکنوں کو انسانی رشتوں سے مربوط کرتے ہیں وہ ادب کی دنیا میں زندۂ جاوید بن کر رہتے ہیں سلیمان اریب بھی ایسے ہی شاعروں میں شمار ہوتے ہیں جو زندگی کی زندہ حقیقتوں کی صبحِ صادق کی ہلکی ہلکی نرم نرم روشنی کو اپنی آنکھوں میں بسا لیتے

ہیں اور سماج کو اپنے تجربات، مشاہدات اور اپنی تخلیقات کے ذریعہ نور و نغمات کی دنیا سے ہم آہنگ کر دیتے ہیں۔ سلیمان اریب ان تمام خوبیوں کا ایک ایسا عکسِ جمیل تھے جن کا رنگِ شاعری پیار، محبت، انسانیت اور رشتوں کی صحیح پہچان کے لئے مشعلِ راہ بنا رہتا ہے حیدرآباد کے شاعروں میں ایک منفرد بانکپن کے ساتھ اپنے شب و روز گذارنے والا شاعر سلیمان اریب میرے دل و دماغ پر ہمیشہ چھایا ہوا رہا۔ میں اریب صاحب کا نہ تو گہرا دوست تھا اور نہ ہی ان کا ہم مشرب و ہم مسلک۔ لیکن ان کے مزاج میں جو حیدرآبادیت کی روح جذب ہو چکی تھی وہ مجھے اپنی طرف کھینچتی تھی حیدرآباد کے شاعروں میں بہت سے ایسے شاعر ملتے ہیں جو اپنی سرزمین کی رفعت و حرمت کو دل و جان کی طرح عزیز رکھتے ہیں۔ اریب صاحب کی نس نس میں حیدرآبادیت بسی ہوئی تھی۔ حیدرآبادی فنکاروں کے مقابلے میں ملک کے دوسرے شاعروں ادیبوں کی غیر ضروری پذیرائی انہیں قطعی پسند نہ تھی وہ اس بات پر قائم تھے کہ پہلے اپنے گھر میں چراغ جلانا چاہیے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ اپنے گھر کا کوئی ایک گوشہ بھی دھندلکوں اور اندھیروں کی زبان میں گفتگو کرے۔ وہ اُجالوں کی زبان جانتے تھے روشنی اور زندگی کی حقیقت سمجھتے تھے اپنی سرزمین کی عظمت و احترام کے لئے بہت کچھ کرنا چاہتے تھے۔ ان میں احساسِ برتری نہیں تھا لیکن احساسِ کمتری کو اپنے لئے، اپنے شہر کے لئے اور اپنے معاشرے کے لئے زہرِ قاتل سمجھتے تھے۔ میرا مشاہدہ ہے کہ جب کبھی ملک کے دیگر علاقوں سے تعلق رکھنے والے شاعر و ادیب حیدرآباد آتے تو اریب صاحب ان سے باوقار انداز

میں اپنی پوری شناخت کے ساتھ ملاقات کرتے تھے اور شعر و ادب کے مختلف موضوعات پر کھل کر گفتگو کرتے تھے۔ اریب صاحب کو یہ گوارا نہیں تھا کہ حیدرآبادی مرعوبیت کا شکار رہیں۔ اریب صاحب نے اپنے بہترین سلیقۂ اظہار کے ساتھ قرطاس و قلم کی آبرو بڑھائی۔ سلیمان اریب کی تمام شاعری کا مطالعہ کیجئے تو پتہ چلتا ہے کہ ان کے پاس مایوسی ایک جرم ہے جو ارتقاء پذیر معاشرہ کے لئے سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ سلیمان اریب کی شاعری کشمکش حیات اور نئے اُجالوں کی شاعری ہے وہ اپنے سامع اور قاری کو ایک ایسی صبح کا پیغام دیتے ہیں جو ہمیشہ پُر نور رہے گا۔ کسی بھی گوشۂ کائنات میں اندھیروں کا چلن نہ ہوگا۔ وہ اس بات کے بھی قائل تھے کہ اندھیروں اور اُجالوں کی جنگ تو برسوں سے جاری ہے جاری رہے گی لیکن فتح و نصرت ہمیشہ اُجالوں کی ساتھ رہے گی۔ سلیمان اریب بہ ذاتِ خود ایک خوش مزاج متوازن طبیعت، خوددار اور اپنی شناخت پر فخر کرنے والے شاعر تھے۔ میں نے بیسیوں مشاعروں میں اُن کے ساتھ کلام سنایا ہے مشاعروں میں چھائے ہوئے رہتے تھے ایک طرح دار شخص کی طرح وہ اپنی ساری زندگی اپنے منفرد بانکپن کے ساتھ گذارتے رہے۔ ادیب صاحب نوجوان شاعروں اور ادیبوں کی حوصلہ افزائی میں ہمیشہ فراخ دلی سے کام لیتے تھے ماہنامہ "صبا" کے ایڈیٹر کی حیثیت سے بھی انہوں نے اردو زبان اور شعر و ادب کی بڑی خدمت کی ہے "صبا" اردو کا صفِ اول کا جریدہ تھا۔ اریب صاحب "صبا" کو زندہ رکھنے کے لئے بے حد پریشان رہے۔ انہیں بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہے ادبی رسالہ نکالنا

اور جاری رکھنا ایک کرشمہ سے کم نہ تھا۔ شہر کے دوسرے نوجوان شاعروں کی طرح میرا کلام بھی "صبا" میں شائع ہوتا تھا۔ اریب صاحب صرف مشاعرہ کے ہی شاعر نہیں تھے بلکہ ادبی رسائل کے ذریعہ انہوں نے اپنی شاعرانہ پہچان بنائی تھی اپنے دور کے صف اول کے شاعروں میں ان کا شمار ہوتا تھا انہوں نے کئی کل ہند مشاعرے پڑھے پُر اعتماد انداز میں کلام سناتے تھے اریب صاحب مشاعروں میں عموماً تاخیر سے پہونچتے تھے اور ان کے ساتھ ابن احمد تاب لازماً لیتے تھے جب اریب صاحب جھومتے جھامتے مشاعرہ گاہ میں پہونچتے تو سامعین کے مرکز توجہ بن جاتے اور اریب وانٹیڈ، اریب وانٹیڈ کی آوازیں بلند ہوتیں جم کر شعر سناتے تھے۔ غزل سے پہلے رباعیات ضرور سناتے تھے خاص طور پر اس رباعی کی لازماً فرمائش کی جاتی تھی۔

پھر حافظ و غالب کو جوانی دیدوں ۔ خیام کو پھر غالب ثانی دیدوں
اک پل کے لئے میں جو خدا بن جاؤں ۔ دنیا کو بس انگور کا پانی دیدوں

میں اپنی ابتدائی شاعری کے زمانے سے ہی اریب صاحب کو اپنا پسندیدہ شاعر سمجھتا رہا ہوں۔ مشاعروں میں وہ میری پذیرائی کرتے تھے۔ معظم جاہی مارکٹ کے قریب واقع عمارت بیچلرس کوارٹرس (محبوب گاہ کا کمرہ نمبر ۱۷) صبا کے دفتر پر ان سے ملاقات کے لئے کبھی جاتا تھا۔ ایک کرسی، ایک ٹیبل، ایک الماری اور زائد دو کرسیاں "صبا" کا پورا اثاثہ تھا ایک چھوٹی سی الماری ان کے اجلاس کے بازو تھی جس میں "صبا" کی فائیلیں رہتی تھیں۔ اس کمرہ کے دوسرے حصہ میں اعجاز قریشی صاحب ایڈیٹر بھارت نیوز کی نشست تھی۔ سلیمان اریب صاحب کا آفس

شاعروں، ادیبوں کے لئے ایک مرکز کی حیثیت رکھتا تھا ہندوستان بھر کے صف اول کے شاعر حیا کے دفتر آتے تھے۔ اریب صاحب کے آس پاس شاعروں، ادیبوں کا ایک بڑا حلقہ موجود رہتا تھا۔ مخدوم صاحب اور شاہد صدیقی صاحب کے علاوہ اس دور کے تقریباً تمام نمائندہ شعراء موجود رہتے تھے شام میں اکثر دفعہ اوریئنٹ ہوٹل چلے جاتے تھے۔ ان کی رفیقۂ حیات صفیہ اریب بھی اکثر ان کے ساتھ رہتیں۔ اریب صاحب کے حیدرآبادی تھے ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ اور پروفیسر عبدالقادر سروری ان کے قدردانوں میں شامل تھے اس دور کے تمام ترقی پسند شاعر و ادیب ان کے ساتھ رہتے تھے اور اکثر مقامات پر انھیں میر کارواں کی حیثیت حاصل رہتی تھی اریب صاحب کے ساتھ میں نے کئی کل ہند مشاعرے پڑھے ہیں وہ اس دور کے جوان سال شاعروں میں مجھے بہت پسند کرتے تھے یہ اریب صاحب کی فراخ دلی اور حوصلہ افزائی کی ایک اعلیٰ مثال ہے کہ انھوں نے انتہائی جونیئر شاعر ہونے کے باوجود مجھے ۲۵ سال پہلے ماہنامہ صبا کی سالگرہ کے بعد اکتوبر ۱۹۵۵ء میں منعقدہ کل ہند مشاعرہ میں مدعو کیا تھا اس مشاعرہ میں جوش ملیح آبادی مجروح سلطانپوری اور دیگر نامور شاعر بھی مدعو تھے اُس زمانے میں تقسیم ملک کے بعد پہلی دفعہ پاکستان کی کرکٹ ٹیم حیدرآباد آئی تھی اس کرکٹ ٹیم کے کھلاڑی بھی مشاعرہ میں موجود تھے جنھیں اہتمام کے ساتھ مخصوص نشستوں پر بٹھایا گیا تھا میں نے بھی اُس مشاعرہ میں کلام سنایا تھا پورے اعتماد کے ساتھ اریب صاحب بہت خوش ہوئے انھیں اتنے بڑے مشاعرے میں ایک مبتدی شاعر

مدعو کر کے شرمندگی اٹھانی نہیں پڑی۔ میری ابتدائی شاعرانہ زندگی کا وہ بہت بڑا کل ہند مشاعرہ تھا میں شہ نشین پر جوش صاحب، مجروح صاحب اور شاہد صدیقی صاحب کے بازو بیٹھا ہوا تھا جوش صاحب نے اپنی مشہور نظم سناتے ہوئے ایک مرحلہ پر مجروح اور شاہد صاحب سے کہا کہ الٹے مصرعے اٹھاؤ۔ شاہد صدیقی صاحب نے چونک کر مجروح صاحب سے کہا جوش صاحب آپ سے کچھ کہہ رہے ہیں۔ اختر حسن صاحب ناظم مشاعرہ تھے۔ جوش صاحب نے اپنی مشہور نظم "ہائے جوانی ہائے زمانے" سنا کر مشاعرے کی فضاء کو درہم برہم کر دیا تھا سینکڑوں خواتین نے اس مشاعرہ میں شرکت کی تھی

سلیمان اریب ہمیشہ مجھ پر مہربان رہے۔ وہ ادبی ٹرسٹ کے مشاعروں میں پابندی سے شرکت کرتے تھے۔ اریب صاحب کی مے نوشی بعض دفعہ مشاعرہ بگاڑ دیتی تھی لیکن اکثر دفعہ وہ مشاعرہ کو زندگی سے ہم کنار کرتے تھے ان کے ساتھ میں نے دو تین مرتبہ پربھنی میں کل ہند مشاعرے پڑھے ہیں۔ اُس وقت ممتاز شاعر میر ہاشم علی صدر نشین بلدیہ تھے وہ اکثر اریب صاحب کو مدعو کیا کرتے تھے اریب صاحب جہاں کہیں جاتے صبا کی خریداری کی مہم چلاتے تھے اریب صاحب کے ساتھ میں نے بودھن کا ایک تاریخی مشاعرہ پڑھا تھا اس مشاعرے میں ہمیں ایڈیٹر پیام قاضی عبدالغفار کے داماد (فاطمہ عالم علی خان کے رفیق حیات) عالم علی خان صاحب ڈائرکٹر نظام شوگر فیکٹری نے مدعو کیا تھا۔ اس مشاعرہ میں حیدرآباد سے سلیمان اریب، شمس الدین تاباں، ابن احمد تاب اور میں مدعو کیے گئے تھے۔ ہم چاروں شاعر ابوالخیر صبا

کی قیادت میں ذریعہ موٹر بودھن پہونچے۔ نظام شوگر فیکٹری کے شاندار گیسٹ ھاوزیس ہمیں ٹھہرایا گیا تھا۔ میں ڈنر میں تو شامل رہا لیکن میں نے محفل مے نوشی میں شرکت نہیں کی۔ مشاعرہ شاندار پیمانے پر منعقد ہوا۔ پروگرام کے مطابق ہم کو مشاعرہ کے بعد صبح ۵ بجے حیدرآباد واپس ہونا تھا لیکن مشاعرہ کے بعد اریب صاحب اور ابن احمد تاب صاحب مے نوشی میں مشغول رہے اور یہ سلسلہ صبح کے بعد تک چلتا رہا۔ جب میں نے اریب صاحب کو بموجب پروگرام حیدرآباد واپس ہونے کے لئے کہا تو ابوالخیر صبا صاحب نے مداخلت کرتے ہوئے کہا کہ ہم شام میں حیدرآباد جائیں گے۔ میں نے محسوس کیا کہ تمام شاعر حیدرآباد واپس ہونے والے نہیں ہیں اس لئے میں نے ڈرائیور سے جو گیسٹ ھاوز کے برانڈے میں سویا ہوا تھا جگایا اور حیدرآباد چلنے کے لئے کہا اور حیدرآباد روانہ ہوا۔ لگ بھگ ۹ بجے صبح حیدرآباد پہونچا۔ حسب پروگرام سکریٹریٹ آفس چلنے سے پہلے سیاست آفس پہونچا ہر روز کی طرح عابد علی خان صاحب اور جگر صاحب کے ہمراہ چائے نوشی ہوئی۔ جب ان شعرائے کرام کا نشہ ٹوٹا تو میرے بارے میں پوچھا۔ مجھے موجود نہ پاکر کافی برہم ہوگئے۔ یہ بات بعد میں مجھے ابوالخیر صاحب نے بتائی ایک اور مشاعرہ میں بھی ایسی ہی صورتحال پیش آئی۔ نارائن کھیڑ (ضلع میدک) میں ایک ایم ایل اے کے الیکشن کے سلسلے میں مشاعرہ تھا حیدرآباد سے ۲،۳ موٹروں میں شعراء کا قافلہ پہونچا تھا۔ ناشتہ کے بعد حیدرآباد واپس ہونے کا پروگرام بنا تھا میری بے چینی بڑھنے لگی۔ بعض شعرائے کرام شمول

اریب صاحب، ابن احمد تاب، خیرات ندیم وغیرہ اپنے مخصوص رنگ میں ڈوب چکے تھے میں اپنی سیاہ ایمبیسڈر کار میں ہندی شعراء بشمبر دیال اور کالی چرن پربت راہی کو لے کر ساتھ لے کر حیدرآباد کے لئے نکل پڑا۔ معلوم ہوا کہ دوسرے شعراء بھی اپنی موٹروں کے ذریعہ حیدرآباد کے لئے روانہ ہوئے لیکن وہ شاعر جو اریب صاحب کے ساتھ تھے وہ رک گئے اور انھیں شام میں جیپ کار کے ذریعہ حیدرآباد آنا پڑا تھا۔ اس طرح کے مرحلوں سے گذرنے کے بعد بھی اریب صاحب مجھ سے خفا نہیں ہوتے تھے حیدرآباد اور اضلاع کے مشاعروں میں مجھے مدعو کرتے تھے اور میں اُن کے ساتھ ذریعہ کار مشاعروں میں شریک رہتا تھا۔ اریب صاحب کے آفس میں زیادہ بیٹھنے والے شاعروں میں شمس الدین تاباں، امان ارشد، ابن احمد تاب شامل تھے کبھی کبھی س۔ا۔ عشرت بھی دکھائی دیتے تھے اریب صاحب کینسر کے مہلک مرض میں مبتلا تھے کینسر ہاسپٹل میں زیر علاج تھے میں اُن سے ملنے کے لئے جایا کرتا تھا آخری دنوں میں وہ بات کرنے میں بے حد تکلیف محسوس کرتے تھے لیکن میں نے اُن کے چہرہ پر ہمیشہ مسکراہٹ دیکھی ایسے لوگ بہت کم ہوں گے جو موت سے لڑتے ہوئے زندگی پر مسکراتے ہیں اریب صاحب ایک صاف و شفاف انسان تھے کھرے سکے کی طرح روشن مثال۔ ان کا شاعرانہ انداز متاثر کن تھا زندگی کے آخری دنوں تک سیکل پر ہی آفس جاتے تھے اگر صفیہ اریب ساتھ ہوں تو رکشا میں بھی آفس آتے جاتے تھے اریب صاحب مشاعروں میں بناسے نوشی شریک نہیں

رہتے تھے۔ لیکن ایک بات قابل تعریف تھی کہ انہوں نے کبھی مشاعروں کی فضا کو مکدر ہونے نہیں دیا۔ سچ تو یہ ہے کہ اریب صاحب کے مشاعرے میں رہنے سے زندگی کی ترجمانی ہوتی تھی۔ اریب صاحب کے انتقال کے بعد "صبا" کے دو تین شمارے ہی نکل سکے۔ ان کا بیٹا حسین ہے جو حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی (گولڈن تھری شولڈ) کا طالب علم رہ چکا ہے صفیہ اریب نوجیون ومینس کالج سلطان بازار میں اردو کی استاد تھیں اریب صاحب کے انتقال کے بعد ادبی محفلوں اور مشاعروں میں بہت کم شریک ہوتی تھیں۔ اریب صاحب ترقی پسند شاعر و ادیب تھے۔ اریب صاحب نے کچھ جدید نظمیں بھی کہی تھیں لیکن ان کی ایک نظم "ڈفر" ہنرمند سے ان کی شاعرانہ حیثیت کو بُری طرح مجروح کیا۔ یہ نظم ان کے دوسرے مجموعۂ کلام کڑوی خوشبو میں شامل ہے پروفیسر مغنی تبسم ان کے قریبی دوست رہے ہیں۔ سیاست اخبار میں جب شعراء کا تعارفی سلسلہ شروع ہوا تو اریب صاحب سے انٹرویو لینے کے لئے مجھے صبا کے دفتر جانا پڑا تھا اریب صاحب نے چائے ملسا کی دوکان معظم جاہی مارکٹ کی دوسری منزل پر واقع ہوٹل میں انٹرویو کے لئے وقت دیا تھا۔ اریب صاحب خوش مزاج انسان تھے۔ شاہ نوری صاحب کے بغیر صبا کا ذکر ادھورا رہ جائے گا۔ صبا کے لئے ہمیشہ ان کا تعاون رہا۔ صبا کو بہترین کتابت سے آراستہ کرنے میں محمد مظہرالدین کاتب کا بڑا دخل رہا۔ اریب صاحب کے چہرہ پر ہمیشہ مسکراہٹ رہتی تھی ــــ خوش طبع، یار باش اور زندہ دل انسان تھے۔

امیر احمد خسرو

قلندرانہ مزاج۔ ملمپیاز شاعر

آج سے ۳۵ برس پہلے آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد کے اُردو سکشن کے پروگرام اگزیکیٹو ایاز انصاری صاحب تھے میں اپنی شاعری کی ریکارڈنگ کے لئے ایک دن آل انڈیا ریڈیو پہونچا۔ دُور سے آتے ہوئے ایک اعلیٰ درجہ کی گیابڈین کی کالی شیروانی میں ملبوس نہایت طرح دار، جاذب نظر، خوش شکل شخص پر میری نظر پڑی۔ وہ اجنبی شخص ایاز انصاری صاحب کے اجلاس کی ہی طرف آرہا تھا میں نے ایاز صاحب سے دریافت کیا کہ یہ کون صاحب ہیں؟ ایاز صاحب نے کہا کہ یہ امیر احمد خسرو ہیں حیدرآباد ہی کے ہیں بھوپال ریڈیو اسٹیشن پر پروگرام اگزیکیٹو تھے ان کا تبادلہ پروگرام اگزیکیٹو کی حیثیت سے حیدرآباد ہوا ہے۔

جب کبھی میں اوراقِ ماضی اُلٹتا ہوں تو خسرو صاحب کی پُرکشش

شخصیت اور اُن کی خوش لکھی میری نظروں میں بچھر جاتی ہے ان دنوں خسرو صاحب سے صرف سلام علیک کی حد تک ہی میری رسم و راہ تھی مجھے یہ بھی یاد نہیں ہے کہ وہ ان دنوں کتنے بہنیے اور کتنے برس حیدرآباد میں رہے۔ حیدرآباد کے بعد گلبرگہ ریڈیو اسٹیشن پر ان کا تبادلہ ہوا وہاں ڈائرکٹر آل انڈیا ریڈیو کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے۔ وظیفہ حسنِ خدمت سے قبل حیدرآباد ریڈیو اسٹیشن پر ہی تھے۔ اُن دنوں خسرو صاحب سے اکثر دفعہ ملاقات ہوتی تھی۔ خسرو صاحب نے اس قدر نیک نامی کے ساتھ ملازمت کی کہ وظیفہ حسن خدمت کے بعد بھی آل انڈیا ریڈیو کا اسٹاف ان کی عزت کرتا رہا خسرو صاحب کی زیرِ نگرانی کئی نوجوانوں نے تربیت حاصل کی۔ خسرو صاحب اور ایاز انصاری صاحب کے علاوہ اے جی فاروقی، عزیز قریشی، اظہر افسر احمد جلیس، کبیر احمد، دانش اقبال نے نت نئے پروگرامس کا آغاز کیا۔ ان کے بعد اسلم فرشوری، جعفر علیخاں اور ڈاکٹر راشد نے بہ حسن و خوبی اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کیا۔ مجھے آل انڈیا ریڈیو سے پہلا پروگرام کلامِ شاعر کے نام سے ملا۔ اُس وقت ۱۵ روپے معاوضہ تھا اور آج ۵۰۰ روپیے معاوضہ مل رہا ہے۔ موہن سہتا اور روپ لعل کی خدمات بھی ناقابلِ فراموش ہیں۔

نامور پروگرام ایگزیکیٹو جیسے ایاز انصاری اور فاروقی صاحب سے پہلے پہلے اشفاق حسین صاحب، مبر حسن صاحب اور ظفر الحسن جیسی شہرت کی

حامل شخصیتیں آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد سے وابستہ تھیں نیرنگ پروگرام کے لئے سب سے زیادہ کام عزیز قریشی صاحب نے کیا۔ انہوں نے ہی نیرنگ پروگرام کا آغاز کیا۔ خسرو صاحب کے دور میں کسی شاعر یا ادیب یا فنکار کو اپنے پروگرامس کی حصولی میں دقت پیش نہیں آئی۔ خسرو صاحب جامعہ عثمانیہ کے مقبول شاعروں میں سے ایک تھے۔ ایک دفعہ محبوب حسین جگر صاحب نے مجھ سے فرمایا تھا کہ جامعہ عثمانیہ میں ایک مشاعرہ پرنس معظم جاہ شجیع کی صدارت میں ہوا تھا جس میں اُس دور کے تقریباً اہم اور منتخب شاعروں نے کلام سنایا تھا اُس مشاعرہ میں امیر احمد خسرو اپنا کلام پرسوز ترنم میں سنا کر مشاعرہ پر چھا گئے تھے۔ خسرو صاحب عابد علی خان صاحب اور جگر صاحب کے پسندیدہ شاعر تھے سیاست میں کلام شائع ہوتا رہتا تھا۔ ادبی ٹرسٹ اور شنکر جی میموریل سوسائٹی کے سالانہ کل ہند مشاعروں میں بطور خاص مدعو کیے جاتے تھے خسرو صاحب نہایت اعتماد کے ساتھ بے نیازانہ انداز میں کچھ ایسے پرکیف ترنم میں کلام سناتے تھے کہ جس سے مشاعرہ کی فضاء جھوم جاتی تھی۔ خسرو صاحب اُن دونوں مشاعروں کے کامیاب شاعر تھے مجھے خسرو صاحب کے ساتھ ۲۰، ۲۵ برسوں تک مشاعروں میں کلام سنانے کا اتفاق ہوتا رہا ہے۔ خسرو صاحب کی زندگی کے آخری ۷، ۸ برسوں میں ان کے انتہائی قریب رہا۔ میں ہر معیاری مشاعروں میں انھیں مدعو کرتا تھا اضلاع کے بہت سے مشاعروں میں ہمارے ساتھ رہتے۔ خسرو صاحب نہایت ہی خوش مزاج

نرم گفتار اور پر اثر شخصیت کے حامل لاجواب شاعر تھے۔ وہ نامور شاعر خورشید احمد جامی کے چھوٹے بھائی تھے اُن کے ہم عصر شاعروں میں سعید شہیدی، علی احمد جلیلی، اوج یعقوبی، خواجہ شوق اور خیرات ندیم بھی تھے۔ ان سے جونیر شاعر جو اکثر مشاعروں میں ان کے ساتھ رہتے تھے۔ رئیس اختر، ناصر کرنولی، ڈاکٹر صادق نقوی، نہال سنگھ ورما، علی الدین نوید تھے۔ وہ ان جونیر شاعروں سے وہ ایک بڑے بھائی کی طرح سر پرستانہ و مشفقانہ انداز میں ملتے تھے اپنے ہم عصر شاعروں کے ساتھ برادرانہ مراسم کے قائل تھے خسرو صاحب نے کسی بھی شاعر کی شاعرانہ عظمت پر نکتہ چینی نہیں کی بلکہ پورے خلوص و دیانت داری کے ساتھ اُن کے کلام پر داد دیتے تھے سعید شہیدی ترنم میں شعر سناتے تھے سعید شہیدی صاحب کا ترنم قدیم روایتی ترنم کا ترجمان تھا لیے حدیپند کیے جاتے تھے لیکن خسرو صاحب کا ترنم ذہن و دل کو یکساں طور پر متاثر کرتا تھا۔ نہایت پُر اثر اور کانوں میں رس گھولنے والا ترنم تھا ان کے ترنم نے حیدرآباد کے بیشتر مترنم شاعروں کو متاثر کیا ہے خسرو صاحب شہر کے بڑے بڑے مشاعروں میں کامیاب ترین شاعر کی حیثیت سے سرخ رو رہا کرتے تھے ادبی ٹرسٹ کے ایک مشاعرہ میں مجھے اب تک یاد ہے کہ خسرو صاحب نے اپنے لحن داؤدی میں ایک ایسی لاجواب غزل سنائی تھی کہ سارا مشاعرہ جھومنے لگا تھا۔ ایک شعر یہ ہیں ؎

کون کہتا ہے سرِ عرش بریں رہتا ہے
وہ تو اک درد ہے جو دل کے قریں رہتا ہے

وہ جو سورج کو ہتھیلی میں لئے پھرتا تھا،
ان ہی تاریک سی گلیوں میں کہیں رہتا تھا

خسرو صاحب سگریٹ پیتے تھے لیکن اعلیٰ درجے کے۔ چائے کم کم پیتے تھے شراب سے انھیں سخت نفرت تھی انھوں نے ساری زندگی شراب کو چھوا تک نہیں۔ نہایت دیندار انسان تھے خسرو صاحب جیسے ہی کسی مشاعرہ میں شرکت کے لئے درخواست کرتا وہ آمادہ ہو جاتے۔ آخری دنوں میں وہ مشاعروں میں وہ اپنی کار میں آتے تھے اکثر و بیشتر دفعہ اپنی کار میں اپنے محلے کے شاعروں سعید شہیدی اور علی احمد جلیلی کو لاتے اور لے جاتے تھے خسرو صاحب کی غزلیں اخبار سیاست میں نمایاں طور پر شائع ہوتی تھیں غزلیں ہی نہیں نظمیں بھی شائع ہوتی تھیں۔ میں خسرو صاحب کے ساتھ جناب علی صدیقی صدر عالمی اردو کانفرنس کی دعوت پر عالمی اردو کانفرنس کے زیر اہتمام دلی کے عظیم الشان کل ہند مشاعرہ میں شریک رہا ہوں وہ مشاعرہ ہم دونوں حیدرآبادی شاعروں کے لئے یادگار مشاعرہ تھا مشاعرہ میں ملک کے تقریباً تمام اہم ادبی اور مشاعرے کے شاعر موجود تھے غالب اکیڈمی آڈیٹوریم میں مشاعرہ ہوا تھا میرے اور خسرو صاحب کے کلام کو بے حد پذیرائی حاصل رہی۔ میں نے اس مشاعرہ میں اپنی تازہ غزل "ہمارے سامنے قاتل ہے کیا کیا جائے' وہ اب بھی زینتِ محفل ہے کیا کیا جائے" سنائی تھی۔ میں نے ملک کے کئی شہروں میں کل ہند مشاعرے پڑھے ہیں لیکن جتنی زیادہ داد دہلی

کے اس مشاعرہ میں ملی کسی اور مشاعرہ میں شاید ہی ملی ہو۔ ویسے میں دہلی میں شنکر شاد کا مشاعرہ بھی پڑھ چکا ہوں۔ میں نے آل انڈیا ریڈیو دہلی کے مشاعرہ میں بھی کلام سنایا ہے جو اسٹوڈیو میں ہوا تھا حیدرآباد سے راشد آذر بھی مدعو تھے۔ جدہ کے ایک یادگار مشاعرہ (۳۰ دسمبر ۱۹۹۲ء) میں میرے علاوہ حیدرآباد سے امیر احمد خسرو اور رئیس اختر بھی مدعو تھے یہ مشاعرہ بزم عثمانیہ جدہ کی جانب سے منعقد کیا گیا تھا اس مشاعرہ کے داعی جناب عارف قریشی تھے اس مشاعرہ میں حیدرآباد کے تینوں شاعروں کو جب اسٹیج پر بلایا گیا تو زوردار تالیوں کے ساتھ استقبال کیا گیا اور تینوں شاعروں کا کلام بے حد پسند کیا گیا۔ جدہ میں خسرو صاحب کے فرزند رہتے ہیں انہوں نے مجھے اور رئیس اختر کو ڈنر پر مدعو کیا تھا خسرو صاحب اپنی زندگی کے آخری دنوں میں مذہبی رنگ میں ڈوب گئے تھے۔ نعتیہ و منقبتی کلام، نہایت عقیدت و احترام کے ساتھ سناتے تھے کل ہند مجلس اتحاد المسلمین کے کل ہند مشاعرہ میں لازماً مدعو کیے جاتے تھے اپنا پُراثر نعتیہ کلام اس انداز سے سناتے تھے کہ مشاعرہ گاہ پر نور و نکہت کی بارش ہونے لگتی تھی۔ میرے زیر انتظام جتنے مشاعرے ہوتے رہے ان میں وہ ضرور شرکت کرتے تھے میرے مشورہ پر انہیں کل ہند مجلس اتحاد المسلمین کے سالانہ جلسہ رحمت اللعالمین میں نعت شریف سنانے کی دعوت دی گئی تھی صنعتی نمائش کے موقع پر ہونے والے سالانہ مشاعروں میں پابندی کے ساتھ مدعو کیے جاتے رہے۔

جناب عابد علی خان صاحب کی رہائش گاہ پر منعقد ہونے والے مشاعروں کے علاوہ

شہر کی بعض نامور شخصیتوں کے ہاں منعقدہ شعری محفلوں میں شریک رہتے تھے مجھے بابقیس علاء الدین (بنجارہ ہلز) اور عظمت عبدالقیوم کی رہائش گاہ پر منعقدہ یادگار مشاعرے آج بھی یاد ہیں اور ان مشاعروں کا تاثر دل و دماغ پر چھایا ہوا ہے۔ خسرو صاحب سے کبھی منتظمین مشاعرہ کو شکایت نہیں رہی۔ خسرو صاحب کے مجموعہ کلام "انکھوا"، "صدف"، "اجالوں کی زبان" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ خورشید احمد جامی کے انتقال کے کئی برسوں بعد خورشید احمد جامی کی یاد کو تازہ رکھنے کے لئے خورشید احمد جامی میموریل اکیڈیمی قائم کی گئی۔ خسرو صاحب کی ناسازی مزاج کی وجہ سے سرگرمیوں میں تعطل پیدا ہو گیا تھا البتہ ایک نمائندہ مشاعرہ ادارہ میرا شہر میرے لوگ کی جانب سے جناب عارف قریشی سکریٹری بزم عثمانیہ جدہ نے خسرو صاحب کی رہائش گاہ پر کیا تھا چونکہ وہ حیدرآباد کے منتخب شاعروں کے کلام کا ایک ویڈیو کیسٹ تیار کرنا چاہتے تھے۔ عارف قریشی نے اس مشاعرہ کے ویڈیو کیسٹ کی رسم اجراء تقریب جدہ میں منعقد کی۔ ڈاکٹر حسن الدین احمد نے مشاعرہ کی صدارت کی تھی اس مشاعرہ کے بعد جامی میموریل اکیڈیمی کی سرگرمیاں ماند پڑ گئیں۔ خسرو صاحب کے انتقال کے بعد سے اکیڈیمی بالکل خاموش رہی۔ میں نے اکیڈیمی کے اس سکوت کو توڑنے کے لئے شخصی دلچسپی لی اور اس کی سرگرمیوں کا آغاز کیا۔ زائد از گذشتہ دو سال سے اکیڈیمی کے جلسے منعقد ہو رہے ہیں جناب افتخار احمد اقبال (برادر خورد امیر احمد خسرو) اکیڈیمی کے صدر ہیں رئیس اختر معتمد عمومی

صلاح الدین نیر، شیر اور جناب شفیع اقبال معتمد اکیڈیمی ہیں۔ خسرو صاحب کی آخری آرام گاہ احاطہ قبرستان کٹل گوڑہ میں ہے خسرو صاحب کی وضع داری اور ان کے شاعرانہ بانکپن کو کبھی بھلایا نہیں جا سکتا۔ کل ہند مشاعروں میں جب وہ مائیک سنبھالتے تو اندازہ ہوتا تھا کہ ایک بے نیاز و قلندرانہ مزاج رکھنے والا شاعر کلام سنانے والا ہے خسرو صاحب کا ترنم کسی اور شاعر سے قطعی نہیں ملتا تھا جب وہ ترنم میں غزل پڑھتے تو مطلع سے مقطع تک داد و تحسین سے نوازے جاتے تھے بہت دیر تک خسرو صاحب کے کلام اور ترنم کا اثر سامعین کے دل و دماغ پر نقش رہتا۔ نامور شاعرہ عظمت عبدالقیوم خسرو صاحب کے ترنم سے اس قدر متاثر تھیں کہ وہ اپنے گھر کے مشاعروں میں اپنا کلام خسرو صاحب کے ترنم میں سنا کرتی تھیں خسرو صاحب ادبی ٹرسٹ اور شنکر جی کل ہند مشاعروں کے علاوہ انجمن ترقی اردو، ادارۂ ادبیاتِ اردو کے تمام مشاعروں میں شریک رہا کرتے تھے خسرو صاحب نے بے شمار مشاعروں کی صدارت کی ہے خسرو صاحب کے بھی بہت سے شاگرد ہوں گے لیکن انہوں نے کبھی اپنے شاگردوں کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ خسرو صاحب کو بزرگانِ دین سے بے حد عقیدت تھی میں نے سنا ہے کہ وہ گلبرگہ میں اپنی ملازمت کے زمانے میں حضرت خواجہ بندہ نواز کی بارگاہ میں اپنا زیادہ وقت گذارتے تھے پابندِ صوم و صلوٰۃ تھے معاشی طور پر مطمئن تھے۔ عارضۂ قلب کی وجہ سے آخری دنوں میں مشاعروں میں کم شریک رہا کرتے تھے

بہت کم لوگ اس بات سے واقف ہیں کہ خسرو صاحب کتنے ہی اہلِ عرض شفلوک الحال حاجت مندوں کی مدد کرتے تھے مرحوم خسرو صاحب تجربہ کار تھے شاعروں میں میرے علاوہ رئیس اختر، ناصر کرنولی، صادق نقوی، نہپال سنگھ ورما اور ولی الدین نوید کے کلام کو بہت سراہتے تھے خسرو صاحب کی شاعری کا اگر یہ غائر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کی شاعرانہ خصوصیات کو اجاگر کرتے ہیں کلاسیکی رنگ کا بہت بڑا دخل ہے کلاسیکی شاعری کے رنگ میں عصرِ حاضر کے تقاضوں کی ترجمانی ان کے اشعار میں ملتی ہے ان کے کلام میں تغزل ہوتا ہے مسائلی اشعار بھی ان کے کلام میں بیشتر ملتے ہیں غزل ہی کی زبان میں مسائلی شعر کہتے ہیں سننے اور پڑھنے سے یہ تاثر ملتا ہے کہ ہم ایک ایسے شاعر سے کلام سُن رہے ہیں جو زندہ زبان میں شعر کہہ رہا ہے خسرو صاحب کو ہم چاہ کر بھی نہیں بھلا سکتے اور وہ شاعر تو انہیں بھول ہی نہیں سکتا جس کے ساتھ ان کا سلوک مشفقانہ ہی نہیں برادرانہ بھی رہا ہے خسرو صاحب مجھے بھی یاد آتے ہیں ان شاعروں کی طرح جو جیب سے قریب لگ جاتے ہیں

خیرات ندیم

خوش مزاج۔ شاعرِ نواز

ادھر موت ہے کہ دہلیز پر کھڑی دستک دے رہی ہے اور ادھر خیرات ندیم ہیں کہ مسکراتے ہوئے موت کا استقبال کر رہے ہیں۔ کس میں اتنی ہمت ہے کہ وہ موت جیسی سچی حقیقت سے لڑتے ہوئے زندگی سے خراج وصول کرتا رہے۔ جو شخص پل پل میں مرتا ہے وہ لمحہ لمحہ جیتا ہے۔

خیرات ندیم ہمارے شہر کے ایک ایسے طرح دار، شاعرانہ طرزِ حیات رکھنے والے شاعر تھے جن کی قدر و منزلت کو شہر کے دانشوروں نے ہی نہیں عام انسانوں نے بھی خراج پیش کیا ہے خیرات ندیم جس محفل میں بھی رہتے تھے وہاں زندگی کے سوا کچھ اور دکھائی نہیں دیتا تھا وہی شاعر ادیب فکر و فن کی دنیا میں اپنا مقام بنا لیتے ہیں جن کی مرضی سے موسم بدلتے رہتے ہیں۔ حالات بدلتے رہتے ہیں۔ مجھے یہ کہتے ہوئے مسرت ہوتی ہے کہ میں نے خیرات ندیم کے ساتھ بے شمار مشاعرے پڑھے ہیں شہر کے ہی

نہیں اضلاع کے بھی اور کل ہند مشاعرے بھی ۔ مجھے یاد نہیں ہے کہ میں نے خیرات ندیم صاحب کو پہلی دفعہ کس مشاعرہ میں سنا تھا لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ جب سے میں نے شاعری شروع کی ہے خیرات ندیم صاحب سے میں واقف ہوں۔ خیرات ندیم صاحب ہمارے شہر کے نمائندہ شاعر تھے شہر کے بڑے شاعروں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ نہایت خوش مزاج محبت کرنے والے مخلص ترین انسان تھے جس مشاعرہ میں بھی وہ شرکت کرتے وہ اپنی شاعرانہ صلاحیت کے ساتھ مشاعرہ پر چھا جانے اور داد و تحسین سے نوازے جاتے۔ خیرات ندیم برسوں ادبی ٹرسٹ اور شنکرجی کل ہند مشاعروں میں کلام سناتے رہے ۔ ان کا ترنم منفرد تھا۔ میں نے ان کے ترنم کی کاپی کرتے ہوئے کسی اور شاعر کو نہیں دیکھا حالانکہ حیدرآباد میں بہت سے شاعر ایسے بھی ہیں جو ترنم میں کلام سناتے ہیں۔ بہت ہی پاٹ دار آواز تھی ان کا ترنم ان کے اشعار کو دو آتشہ بنا دیتا تھا۔ خیرات ندیم اپنی زمین کی قدر و قیمت کا ہمیشہ احترام کرتے تھے بیرونی شعراء سے جب بھی شعر و ادب کے موضوع پر گفتگو رہتی تو خیرات ندیم چھائے ہوئے رہتے ۔ حیدرآباد کی شاعرانہ فضاء کو انھوں نے زندگی کے آخری لمحوں تک برقرار رکھا۔ عظمت تہذیب دکن کی پاسداری کرتے رہے اپنے حیدرآبادی ہونے پر فخر محسوس کرتے تھے۔ خیرات ندیم اپنے خاص شاعر دوستوں سے بے تکلفانہ گفتگو کرتے تھے۔ سعید شہیدی، اوج یعقوبی کنول پرشاد کنول جیسے نامور شاعروں سے اس طرح گفتگو کرتے جیسے

ان کے لنگوٹی یار ہیں کسی اور شاعر میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ حضرت سعید شہیدی جیسے نازک مزاج شاعر سے بے تکلفانہ گفتگو کرے۔
خیرات ندیم کے ساتھ سفر کرنے میں بے حد لطف آتا تھا وہ تھے تو بہت سیدھے سادے لیکن شاعرانہ مزاج رکھتے تھے۔ خوش طبع، خوش فکر انسان تھے اپنی شاعری پر ہی نہیں کسی اور حیدرآبادی شاعر کے کلام پر بھی بے جا تنقید برداشت نہیں کرتے تھے۔ خیرات ندیم نے بے شمار کل ہند مشاعرے پڑھے ہیں۔ مجھے ان کے ساتھ کئی کل ہند مشاعروں کے سلسلے میں سفر کرنے کا موقع ملا ہے ۲۵ سال پہلے علی صدیقی صاحب نے ممبئی کے بہت بڑے فائیو اسٹار ہوٹل میں ایک شاندار کل ہند مشاعرہ منعقد کیا تھا۔
مشہور میوزک ڈائرکٹر و شاعر نوشاد صاحب نے صدارت کی تھی منتظمین مشاعرہ میں نامور فلمی اداکار سنیل دت شامل تھے مشاعرہ میں حیدرآباد سے سعید شہیدی، کنول پرشاد کنول، خیرات ندیم اور صلاح الدین نیر مدعو تھے اس مشاعرہ میں خیرات ندیم صاحب نے اپنی ایک مرصع غزل سنائی تھی جس کے اثر سے ساری محفل جھوم اٹھی تھی۔ مجھے ان کے ساتھ اضلاع کے بہت سے مشاعرے پڑھنے کا اتفاق ہوا اکثر دفعہ ہم ذریعہ کار مشاعروں میں شرکت کے لئے جاتے تھے۔ پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ ۳، ۴ گھنٹوں کا سفر کس طرح کٹا۔ خیرات ندیم صاحب کو بہت ہی عمدہ عمدہ لطیفے یاد تھے ان سے ہر شاعر خوش رہتا۔ کوئی ایک شاعر بھی ایسا نہیں تھا جو ان سے ناخوش رہا ہو۔

محبوب نگر کے ایک مشاعرہ کے داعی جناب صولت صاحب ایڈوکیٹ تھے جو خود بھی ایک ممتاز شاعر تھے اُن دنوں محبوب نگر میں صولت صاحب زیادہ تر مشاعروں کا اہتمام کرتے تھے۔ ایک مشاعرے میں ہم دیر سے محبوب نگر پہونچے۔ تمام شاعروں کو گیسٹ ہاوز میں لے جایا گیا۔ ڈنر کا اچھا خاصہ انتظام تھا بریانی کے ساتھ میٹھا اتنی کم مقدار میں تھا کہ تمام شعراء تک اس کی رسائی ممکن نہ تھی۔ صولت صاحب کی ہدایت پر طشتریوں میں میٹھا لایا گیا چونکہ میٹھا قریب الختم تھا اس لئے چمچہ بھر میٹھا طشتری میں پھیلا دیا تاکہ زیادہ دکھائی دے۔ خیرات ندیم صاحب کی جب طشتری پر نظر پڑی تو صولت صاحب کو بلوا کر کہا صولت صاحب یہ میٹھا ہے؟ آپ نے تو طشتری پر پینٹنگ کی ہے۔ صولت صاحب شرمندہ ہو گئے حالانکہ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ خیرات ندیم صاحب نہایت بذلہ سنج انسان تھے مگر وہ کبھی شاعر کا مذاق نہیں اڑاتے تھے اُن کا کلام سیاست اخبار میں پابندی سے شائع ہوتا رہا۔ ماہنامہ صبا اور ... میں بھی شائع ہوتا رہا ہے خیرات ندیم کے دو شعری مجموعے "صفِ مژگاں" اور "موسم خزاں سلامت" ہیں۔ مجھ جیسے جونیر شاعروں کی پذیرائی میں کبھی بخالت سے کام نہیں لیتے تھے۔ کنول پرشاد کنول سے کچھ زیادہ ہی بے تکلف تھے کبھی کبھی اُن کی شاعری کو ظریفانہ تبصروں سے نوازتے تھے لیکن کنول پرشاد کنول کی قدر کرتے تھے۔

خیرات ندیم کو بنتِ عنب سے عشق تھا لیکن میں نے کسی مشاعرے میں بھی

ان کو نشہ کی حالت میں لڑکھڑاتے ہوئے نہیں دیکھا۔ مے نوشی کے بہانے کبھی انہوں نے مشاعروں کی فضا کو مکدر نہیں کیا۔ سگریٹ بہت زیادہ پیتے تھے۔ خیرات ندیم کا حافظہ بہت تیز تھا انھیں اساتذہ سخن کے بہت سے شعر یاد تھے۔ خیرات ندیم کے لطیفے سنانے کا انداز منفرد تھا۔ لطیفہ سناتے ہی بے ساختہ اس طرح ہنستے تھے کہ ساری محفل پوری طرح متوجہ ہو جاتی۔ ہر قسم اور ہر مزاج کے لطیفے سناتے تھے۔ مجازؔ اور راجہ مہدی علی خان سے متعلق بہت سے لطیفے ان کو یاد تھے۔ خورشید احمد جامیؔ صاحب کے شاگرد تھے لیکن اُن دونوں میں استادی اور شاگردی کا انداز نہیں تھا آپس میں بہت اچھے دوست تھے۔ خیرات ندیم کلاسیکی مکتب خیال کے شاعر تھے ترقی پسندانہ شعر بھی کہتے تھے حیدر آباد کے ترقی پسند مصنفین میں سے ایک تھے۔ پیشۂ درس و تدریس سے وابستہ تھے۔ شہر کے مختلف اسکولوں میں ایک منفرد و بہترین استاد کی حیثیت سے شہرت رکھتے تھے۔ شہر کی نمائندہ شخصیتوں سے ان کے روابط تھے چاہے وہ جونیر ہوں کہ سینیر شاعر ہوں ہر ایک کے ساتھ حسب مراتب روابط رکھتے تھے۔ پرانے شہر کے شاعروں میں خاص طور پر سعید شہیدی، اوج یعقوبی، خواجہ شوق، طالب رزاقی، ابن احمد تاب سے کچھ زیادہ ہی یارانہ تھا۔ علامہ حیرت بدایونی، مخدوم محی الدین شاہد صدیقی، سلیمان اریب اور شاذ تمکنت جیسے شہر کے نمایاں شاعروں سے بھی بہترین روابط تھے۔ ان کی خوش مزاجی کی وجہ سے بھی شہر کے باشعور لوگ ان سے اپنے مراسم بڑھانے میں دلچسپی رکھتے تھے۔ شاعروں کی گروپ بندی

سے انھیں کسی بھی قسم کا سروکار نہ تھا وہ پیر اپنے شہر کی ہر محفل میں شرکت کرتے تھے چاہے وہ علامہ نجم آفندی کی محفل ہو کہ مولانا کامل شطاری کی یا حضرت قدیر عریضی کی بزم شعر و سخن۔ خیرات ندیم نے اساتذہ سخن اور سینیئر شاعروں کی عزت و احترام میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ مشاعروں میں آداب محفل کا خیال رکھتے ہوئے اچھے شعر پر داد دینے میں پیش پیش رہتے مقبول شاعر ہونے کے باوجود وہ دوسرے شاعروں کا کلام بھی پوری توجہ سے سنتے تھے اچھے شعر ہوں تو کھل کر داد دیتے تھے۔ خیرات ندیم صاحب خوش مزاج، خوش لباس، باغ و بہار شاعر تھے۔ گینگرین کے عارضہ میں مبتلا تھے ڈاکٹروں کے مشورہ سے ان کا نصف پیر گھٹنے کے نیچے سے کاٹ دیا گیا تھا ڈاکٹروں کی ہی رائے تھی کہ جان بچانے کے لئے پیر کاٹ دیا جائے ورنہ یہ مرض پورے جسم میں پھیل جائے گا اس عارضہ میں تقریباً دو سال تک مبتلا رہے۔ علالت کے زمانے میں محلہ گل گوڑہ میں واقع اپنے گھر کے دیوان خانے میں وہ ایک تخت پر لیٹے رہتے تھے۔ شہر کے تقریباً تمام شاعر ان سے ملاقات کے لئے آتے وہ تمام شاعروں سے خوش مزاجی کے ساتھ ملتے تھے۔ شام کے وقت شاعروں کا دربار سجتا تھا وہ لطیفے سناتے رہتے۔ انہوں نے کبھی یہ اندازہ ہی ہونے نہیں دیا کہ وہ بیمار ہیں اپنے دوستوں میں گھرے رہتے تھے کبھی کبھی کلام بھی سناتے لیکن زیادہ تر حالات حاضرہ پر گفتگو رہتی۔ ہنسی مذاق کا ماحول رہتا۔ ان کی گفتگو کی تان ان کے برجستہ لطائف پر ٹوٹتی تھی خیرات ندیم

سے پاس زیادہ بیٹھنے والے امیر احمد خسرو، ممتاز شاعرہ عزیز النساء صبا کے شوہر
احسان اللہ خان، سری نواس لاہوٹی، مسیح انجم اور روشن خیال تھے میں بھی
اُن کے پاس گاہے گاہے ملنے جاتا تھا۔ اکثر دفعہ میں نے ڈاکٹر صادق نقوی کو بھی خیرات ندیم
کے پاس دیکھا ہے خیرات ندیم اتنے مجلسی انسان تھے کہ ان کے پاس لوگ کھنچے
کھنچے چلے آتے تھے خیرات ندیم کچھ دنوں فلمی تصویر کے ادبی شعبے کے ایڈیٹر
رہے۔ شہر کی نمائندہ ادبی انجمنوں سے وابستہ رہے ان کے شعری مجموعوں میں
ایک مجموعۂ کلام صفِ مژگاں ادبی ٹرسٹ کی جانب سے شائع ہوا وہ شاعروں
کے دکھ درد میں برابر کے شریک رہتے تھے کچھ مہینوں تک پرنس معظم جاہ شجیع
کے ہاں بھی جاتے رہے۔ ڈاکٹر سید عبدالمنان کے زیرِ علاج رہے۔ ڈاکٹر صاحب
خیرات ندیم کی شاعری کے بڑے مداح تھے۔ خیرات ندیم کو مذہبیات سے بھی
گہرا لگاؤ تھا اپنے محلے کی مسجد چیونٹی شاہ کے کئی برس تک صدر رہے۔
خیرات ندیم ادارۂ ادبیاتِ اردو اور انجمن ترقی اردو کے ہر مشاعرہ میں مدعو
رہتے۔ ڈاکٹر زور ان کے قدردان تھے۔ انجمن ترقی اردو کے زیرِ اہتمام شہر
اور اضلاع میں ہونے والی اردو کانفرنسوں کے مشاعروں میں لازماً مدعو
کیے جاتے تھے خیرات ندیم نہایت صاف گو، صاف باطن، پاک طینت انسان
تھے ان کے دوستوں کا حلقہ بہت وسیع تھا سازی مزاج کی وجہ سے جب کبھی
کہا جاتا تو علالت کے باوجود مشاعروں میں شرکت کرتے تھے با حوصلہ ہمت والے
انسان تھے خیرات ندیم صاحب کا بے نیاز طرزِ حیات اپنے معاصرین کے لئے قابلِ تقلید تھا
جو حیدرآباد کی شعری، ادبی و تہذیبی تاریخ میں یاد رکھا جائے گا حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

شاذ تمکنت

نزاکت پسند۔ نازک مزاج شاعر

شاذ تمکنت سے نہ تو میرے شخصی مراسم تھے اور نہ ہی وہ میرے قریبی دوستوں میں شامل تھے۔ شاذ تمکنت مجھ سے سینیر شاعر تھے ان کے احباب کا ایک علحدہ حلقہ تھا۔ ان کی نشست و برخواست بھی اپنے مخصوص دوستوں کے ساتھ رہتی تھی۔ شاذ تمکنت شاعروادیبا سے اپنا گہرا رشتہ رکھتے تھے اور میں ہمیشہ رندوں کی محفلوں سے دور رہتا تھا (اگرچیکہ ان کے ساتھ اُٹھنا بیٹھنا ضرور رتھا) جہاں تک شاذ صاحب کی شاعری کا تعلق ہے میں ان کی شاعری کا قدردان ہوں بے حد پسند کرتا ہوں وہ ہمارے شہر کے ہی نہیں اُردو دنیا کے ایک منفرد و مقبول شاعر تھے شاذ صاحب نے غزلیں بھی کہی ہیں اور نظمیں بھی۔ فارسی زبان اور فارسی ادبیات سے واقفیت کی وجہ سے ان کی شاعری میں فارسی کے بہت سے الفاظ ملتے ہیں۔ بہت ہی عمدہ شاعری کرتے تھے تحت اللفظ میں شعر

پڑھتے تھے پڑھنے کا انداز پُر اثر ہوتا تھا ان کے ساتھ میں نے بہموں مشاعرے پڑھے ہیں وہ ایک کامیاب اور مقبول شاعر کی طرح محفلوں میں چھائے ہوئے رہتے تھے اضلاع کے مشاعروں کے علاوہ ملک کے دوسرے علاقوں اور دلی کے مشاعروں میں بھی اُن کا ساتھ رہا ہے۔

شاذ تمکنت صاحب میں شاعرانہ بانکپن، مزاج کی نزاکت اور طبیعت میں خاص رکھ رکھاؤ تھا۔ ہمارے شہر کے تمام شاعروں میں شاذ تمکنت کی شناخت ان کے مخصوص رکھ رکھاؤ کی وجہ سے بھی باقی رہے گی۔ اکثر مشاعروں میں یہ حالت نشہ میں آتے تھے لیکن ان کی مے نوشی نے کبھی مشاعروں کی فضا کو بگاڑا نہیں۔ خوش لباسی کا ہمیشہ خیال رکھتے تھے انداز گفتگو تیا تُلا ہوتا تھا۔ شاعروں سے اُن کے دوستانہ مراسم کم ہی تھے پھر بھی انہوں نے ایک ایسا حلقہ بنا لیا تھا کہ اُن کے آس پاس کچھ لوگ جمع رہتے تھے جن میں شاعروں، ادیبوں کے علاوہ عام آدمی بھی ہوتے تھے جو شاذ تمکنت کی جام و مینا سے تواضع کرتے ہوئے مسرت محسوس کرتے تھے۔ شاذ تمکنت صاحب نے ایوننگ کالج جامعہ عثمانیہ سے ایم اے کامیاب کیا۔ بے روزگاری کے زمانے میں مختلف جگہ کام کرتے رہے۔ بیدر و کالج میں پارٹ ٹائم اور انوار العلوم کالج میں فل ٹائم لکچرر رہے۔ "مخدوم محی الدین حیات اور کارنامے" پر جامعہ عثمانیہ سے ڈاکٹر مغنی تبسم کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کے لئے مقالہ لکھا۔ ڈاکٹر بن گئے پھر جامعہ عثمانیہ میں ریڈر شعبۂ اُردو کی حیثیت سے مقرر ہوئے اور تاحیات اسی خدمت پر فائز رہے۔ شاذ تمکنت کا کلام ہندوستان

پاکستان کے معیاری ادبی رسائل میں چھپتا رہا۔ روزنامہ سیاست میں بھی اُن کا کلام شائع ہوتا تھا حیدرآباد کے مقبول ترین شاعروں میں ان کا شمار ہوتا تھا انہوں نے حیدرآباد میں بعض کل ہند مشاعروں کی نظامت کے فرائض بھی انجام دیئے مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی کی جانب سے احاطہ کنگ کوٹھی میں منعقدہ مشاعرہ کی بھی نظامت کی جس میں دلیپ کمار صاحب نے شرکت کی تھی اس مشاعرہ میں ہزاروں خواتین و حضرات نے شرکت کی تھی مشاعرہ میں سعید شہیدی، کنول پرشاد کنول، شاذ تمکنت، خیرات ندیم صلاح الدین نیر، رئیس اختر، ناصر کرنولی اور دیگر شاعروں نے کلام سنایا تھا شاذ صاحب ادبی ٹرسٹ اور شنکرجی میموریل سوسائٹی کے کل ہند مشاعروں میں بھی پابندی کے ساتھ شرکت کرتے تھے۔ انہیں یہ بھی اعزاز حاصل تھا کہ انہوں نے لال قلعہ کے مشاعرہ میں بھی شرکت کی تھی پاکستان میں بھی مشاعروں کے سلسلے میں مدعو رہے ملک کی تقریباً ہر ریاست کے مشاعروں میں کلام سنا چکے تھے میری ابتدائی شاعری کے زمانے میں کل ہند مشاعروں میں کلام سنانے والے شاعروں میں مخدوم محی الدین، شاہد صدیقی، کنول پرشاد کنول، سلیمان اریب، شاذ تمکنت، وحید اختر، عزیز قیسی وغیرہ تھے۔ جاں نثار اختر اور اختر الایمان سے ان کے اچھے خاصے مراسم تھے شہریار زبیر رضوی، ندا فاضلی سے دوستانہ و شاعرانہ روابط تھے شہر کے تمام ادبی حلقوں میں شاذ تمکنت کی شاعرانہ عظمت کا احترام کیا جاتا تھا ان کے دوستوں میں مشہور قوال عزیز احمد خاں وارثی بھی تھے جنھوں نے شاذ

کی ایک مناجات "کب تک میرے مولا" سنا کر شاذ تمکنت کی شہرت میں چار چاند لگا دیئے۔ مناجات و حمد کے علاوہ وارثی صاحب نے شاذ تمکنت کی غزلیں بھی ساز پر پیش کی ہیں۔ شاذ تمکنت کے شعری مجموعوں کی تفصیل کچھ اس طرح ہے۔ "تراشیدہ" "نیم خواب" "دست فرہاد" "بیاض شام" "ورق انتخاب" شاذ تمکنت اپنے شاعرانہ انفرادیت کو کبھی متاثر ہونے نہ دیا۔ شاذ تمکنت کی نثر بھی بہت عمدہ ہے لیکن انہوں نے شاعری پر زیادہ توجہ دی۔ نثر میں ان کے مضامین بہت کم ملتے ہیں بہت سے شاعروں کے کلام پر دیباچے بھی لکھے ہیں شاعری میں غالباً شاہد صدیقی سے مشورۂ سخن کرتے تھے ان کے ہم مرتبہ شاعروں میں ڈاکٹر وحید اختر کا نام بھی اہم ہے ویسے عزیز قیسی بھی ان کے اچھے ساتھی تھے لیکن سلیمان اریب کی سرپرستی اپنی جگہ مسلمہ رہی ہے۔ شاذ تمکنت صاحب مخدوم محی الدین، شاہد صدیقی، علامہ حیرت بدایونی کی شاعرانہ حیثیت کو دل کی گہرائیوں سے خراج پیش کرتے تھے پرانے شہر کے شاعروں میں سعید شہیدی، ڈاکٹر علی احمد جلیلی، اوج یعقوبی، خواجہ شوق، خیرات ندیم کی شاعرانہ اہمیت کے معترف تھے۔ کنول پرشاد کنول کا تذکرہ بھی خوش اسلوبی کے ساتھ کرتے تھے شاذ تمکنت ملے پلی (فتلانی میدان) میں رہتے تھے اسی محلے (حبیب نگر) میں علامہ حیرت بدایونی بھی رہتے تھے علامہ سے ان کی ملاقات کم رہتی تھی۔ شاذ صاحب ایوان اردو اور انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام ہونے والے مشاعروں میں مدعو رہتے تھے اور اپنی منفرد شاعری کے سبب اچھا خاصا رنگ جماتے تھے

کثرت مے نوشی نے ان کی صحت کو بُری طرح متاثر کیا تھا ڈاکٹر منان صاحب کے زیر علاج رہے۔ ڈاکٹر صاحب شاذ صاحب سے ہمیشہ کہتے تھے کہ شراب تمہارے لئے زہر ہے مت پیا کرو لیکن "چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی"۔ چنانچہ کثرت شراب نوشی ہی ان کی موت کا باعث بنی۔ شاذ تمکنت کی صحت کافی گر چکی تھی بہت کمزور ہو گئے تھے۔ شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ کے ارباب مجاز کا یہ کہنا تھا کہ شاذ تمکنت کبھی وقت پر یونیورسٹی نہیں آتے تھے یا اوقات آتے بھی نہیں تھے لیکن ان کی شاعرانہ عظمت کے سبب اُن سے کافی رعایت کی جاتی تھی ماہنامہ صبا میں شاذ تمکنت کا کلام چھپتا تھا غزلیں ہی نہیں نظمیں بھی شائع ہوتی تھیں۔ ان کا مجموعۂ کلام تراشیدہ بھی کافی مقبول ہوا ناشر حسامی بکڈپو کے ارباب مجاز ہیں۔ پروفیسر مغنی تبسم اور عوض سعید اُن کے خاص دوستوں میں شامل تھے۔ شاذ تمکنت صاحب نے اپنی شاعرانہ پہچان کے سبب حیدرآباد کا نام روشن کیا۔ شاذ تمکنت کی شاعری پر بہت کچھ لکھا جانا چاہیے۔ آج نہیں تو کل ضرور لکھا جائے گا حیدرآباد میں بہت سے ایسے اعلیٰ درجے کے شاعر گزرے ہیں جن پر حیدرآباد کے قلم کاروں کو لکھنا چاہیے۔ شاذ صاحب کنول پرشاد کنول کی دوست نوازی کی وجہ سے رسالہ آندھرا پردیش میں مستقل طور پر کتابوں پر تبصرہ لکھا کرتے تھے جہاں سے انھیں مناسب معاوضہ ملتا تھا۔ رسالہ آندھرا پردیش میں اُن کا کلام بھی شائع ہوتا تھا۔

شاذ تمکنت صاحب نے ریڈیو اور دُور درشن کے ذریعہ اپنے کلام سے ادب دوستوں کو استفادہ کا موقع فراہم کیا۔ ہندی کے مشہور شاعر نہپال سنگھ ورما شاذ تمکنت کے بہترین دوستوں میں سے ایک ہیں۔ ورما صاحب کو شاذ صاحب "راجے" کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ شاذ تمکنت کا انتقال ۱۸ اگست ۱۹۸۵ء کو ہوا اور انھیں احاطہ درگاہ یوسفینؒ کے قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا ■